تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور - پاکستان

اہم اعلان

مولانا امین احسن اصلاحی کی درج ذیل معرکۃ الآراء تصانیف کے مکمل نظرثانی شدہ جدید ایڈیشن الحمدللہ شائع ہو گئے ہیں:

- دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار ۔/۴۰ روپے
- حقیقتِ نماز ۔/۴۲ روپے
- حقیقتِ تقویٰ ۔/۲۲ روپے
- حقیقتِ شرک و توحید ۔/۵۶ روپے
- مبادیٔ تدبرِ قرآن ۔/۳۶ روپے
- قرآن میں پردے کے احکام ۔/۴ روپے
- اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام ۔/۳۰ روپے
- تزکیۂ نفس ۔ جلد دوم ۔/۳۶ روپے
- مبادیٔ تدبرِ حدیث ۔/۳۶ روپے

علاوہ ازیں ان کی مندرجہ ذیل کتب بھی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں جو ان شاء اللہ جلد دستیاب ہوں گی:

- اسلامی قانون کی تدوین
- اسلامی ریاست
- مجموعہ تفاسیرِ فراہی
- مقالاتِ اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن
۱۲۲۔ فیروز پور روڈ لاہور ۵۴۶۰۰
فون: ۲۶۳۴۷۷

تدبّر

سلسلہ نمبر ۳۰ جمادی الاوّل ۱۴۱۰ھ دسمبر ۱۹۸۹ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

کچھ تدبر کے بارے میں ـــــ خالد مسعود ـــــ صفحہ نمبر ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورہ انعام (۵) ـــــ خالد مسعود ـــــ ؍؍ ۵

اسالیبِ قرآن (۳) فصل ـــــ خالد مسعود ـــــ ؍؍ ۱۲

تدبرِ حدیث

جانوروں کی زکوٰۃ ـــــ امین احسن اصلاحی / سعید احمد ـــــ ؍؍ ۱۷

صحیح بخاری ـــــ امین احسن اصلاحی / سعید احمد ـــــ ؍؍ ۲۵

افاداتِ فراہیؒ

حکمتِ قرآن (۸) ـــــ خالد مسعود ـــــ ؍؍ ۲۸

مقالات

رسولِ اکرمؐ کی دعوت کی خصوصیات ـــــ خالد مسعود ـــــ ؍؍ ۴۱

مجلسِ ترتیب

* ——— خالد مسعود (مدیر)
* ——— عبداللہ غلام احمد
* ——— ماجد خاور
* ——— محبوب سبحانی

ناشر: ——— ادارہ تدبر قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور۔ ۲۵

مطبع: ——— المطبعة العربيّة ۔ لاہور

قیمت: ۵/ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

کچھ تدبر کے بارے میں

اس وقت تدبر کا تیسواں شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ رسالہ کی اشاعت کے آغاز ہی سے ہمارے سامنے یہ مقصد رہا ہے کہ اس کو فکرِ فراہی کی ترویج کا ذریعہ بنایا جائے اور اس ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ، جو کام کر رہے ہیں لیکن کبر سنی کے باعث اس کو سپردِ قلم کرنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ اس کو مرتب کر کے اس کے قدردانوں تک پہنچایا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ تدبر کے ذریعہ سے یہ کام خاصی مقدار میں ہو گیا ہے۔ مولانا مدظلہ کی تصانیف تزکیۂ نفس، اصولِ تدبرِ حدیث اور فلسفۂ اسلامی اس میں مکمل چھپ چکی ہیں اور تزکیۂ نفس تو کتابی شکل میں شائع ہو کر بازار میں بھی آچکی ہے۔ مؤطا امام مالک کا مکمل درس ریکارڈ ہو چکا ہے لیکن ٹیپ سے اس کی بازیابی اور ایڈیٹنگ خاصا وقت طلب اور طویل کام ہے لیکن اس کا بھی آغاز ہو چکا ہے اور تدبر کے قارئین اس کے بعض مباحث کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ جن کی ترتیب میں جناب ماجد خاور اور جناب سعید احمد نے حصہ لیا ہے۔ دونوں رفیق اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

قارئین کے لیے یہ بات خوشی کا باعث ہو گی کہ سعید احمد صاحب نے مولانا کے فلسفہ کے مضامین کو انگریزی زبان میں منتقل کر لیا ہے۔ اس وقت وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مولانا مدظلہ نبوت کے موضوع پر اپنے لیکچر کا دوسرا حصہ مکمل کریں تو وہ اس کا ترجمہ کر کے کتاب کی اشاعت کا انتظام کریں۔ امید ہے جلد اس کتاب کی تکمیل کی نوبت آجائے گی۔

فکرِ فراہی کی ترویج کے لیے پاکستان اور ہندوستان میں اب کئی ادارے کام کر رہے ہیں اگرچہ ان کی صلاحیتوں اور فکری تربیت میں خاصا فرق ہے اور ان کے درمیان تعاون یا مشاورت کی کوئی مؤثر شکل ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی۔ مولانا مدظلہ کی نگرانی میں اگر یہ

کام ہوسکے تو فکر کے استحکام کے لیے یہ بے حد مفید ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام ادارے اپنی جد وجہد کو مربوط کریں۔ وہ جن جہتوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس سے دوسروں کو بھی آگاہی ہوتا کہ اگر ممکن ہو تو وہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں تعاون کر سکیں۔ ادھر بعض نئے لوگوں میں بھی اس فکر کے ساتھ نسبت اور اس کی خدمت کا حوصلہ دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ بات اس اندازِ فکر کے موثر ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ بات تو قارئین کے لیے یقیناً باعثِ مسرت ہوگی کہ ایک عالم دین نے اپنے طور پر تفسیر تدبر قرآن کا پشتو زبان میں ترجمہ شروع کر دیا ہے۔ ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور ہم اس کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔

حکمتِ قرآن کے عنوان سے افاداتِ فراہی کا سلسلہ گزشتہ کئی اشاعتوں میں قارئین کی نظر سے گزرا ہے۔ جب اس کا آغاز ہوا تو یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ مولانا فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب حکمت القرآن کا ترجمہ ہے۔ جب وہ کتاب ختم ہوگئی تو ایک اور مسودہ کو ترجمہ کیلئے منتخب کیا گیا۔ اس کا نام حکمتہ دیانتہ الاسلامیہ ہے۔ چونکہ اس کے مباحث کا تعلق بھی حکمت ہی سے تھا۔ اس لیے ہم نے دوسری کتاب کے مضامین کو بھی حکمت قرآن ہی کے عنوان کے تحت لے لیا۔ الحمدللہ کہ اس کتاب کی آخری قسط بھی اس شمارہ کی زینت ہے۔

اس شمارہ میں ایک مضمون امام بخاریؒ کی الجامع الصحیح کے بارے میں دیا جا رہا ہے۔ مولانا مدظلہ' مؤطا کے درس سے فارغ ہونے کے بعد ان دنوں اپنے رفقاء کو بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں۔ صحیح بخاری کتب حدیث میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے اور مولانا بھی نہایت جانفشانی سے اس کو پڑھا رہے ہیں۔ یہ قارئین کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ اس اہم کتاب کے دروس کے لیے ان کو مؤطا کی تکمیل تک انتظار کرایا جائے۔ لہذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ دونوں کتابوں کے دروس ترتیب دے کر ایک ساتھ شامل اشاعت کیے جائیں۔ چونکہ دونوں کے مباحث الگ الگ ہوں گے۔ اس لیے قارئین کو ان شاء اللہ مضامین کی یکسانی کی شکایت نہیں ہوگی۔ صحیح بخاری پر جو مضمون شائع کیا جا رہا ہے یہ ایک تمہیدی مضمون ہے۔

ان صفحات میں ہم نے کبھی قارئین سے کسی تعاون کی درخواست نہیں کی۔ لیکن یہ حقیقت بہر حال سامنے رہنی چاہیئے کہ یہ ادارہ رفقاء کے تعاون ہی سے اتنی کامیابی حاصل کر سکا ہے۔ جن لوگوں کے اس کے مقاصد سے اتفاق ہے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ کم از کم تدبر کے حلقۂ اشاعت کو بڑھانے میں ہماری مدد فرمائیں تاکہ اس کی تحریریں زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچ سکیں۔ امید ہے قارئین اس اپیل کو قرار واقعی اہمیت دیں گے۔

خالد مسعود

تفسیر سورۃ انعام

اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے۔ کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کچھ نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیداوار کی اور زیتون اور انار باہم دگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو۔ اور اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۞ اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے قد کے بھی۔ تو اللہ نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۞ ۱۴۲

چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو، بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں

لہ یعنی زمین کی گوناگوں اقسام کی پیداوار ہو یا مال مویشی جو سواری اور باربرداری کے لیے موزوں ہیں یا دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے لیے پالے جاتے ہیں، سب خدا ہی نے پیدا کیے ہیں اور اسی کی عنایت سے تمہیں ملے ہیں۔ ان کے وجود سے جہاں اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا بڑا ہی جواد و کریم اور فیاض و مہربان ہے جس نے انسان کو اس سارے ساز و سامان سے بلا استحقاق فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، وہیں یہ نعمتیں یہ تعلیم دیتی ہیں کہ ان میں سے ہر نعمت کا ایک حقِ واجب یہ ہے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کیا جائے، اس میں ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو اس نعمت سے محروم ہیں اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہو کر ان میں اپنے جی سے تحریم و تحلیل نہ کی جائے۔

میں سے نر و مادہ دو، پھر ان سے پوچھو کر ان دونوں کے نروں کو حرام کیا
ہے یا دونوں مادینوں کو یا اس بچے کو جو ان مادینوں کے رحم میں ہے؟ اگر تم سچے
ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح اونٹوں میں سے نر و مادہ دو
اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو، پھر پوچھو کر ان دونوں کے نروں کو حرام ٹھہرایا
ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو ماداؤں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اس وقت
موجود تھے جب اللہ نے تمہیں اس کی ہدایت فرمائی؟ تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے
جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے ۸۹ بے شک اللہ ظالموں
کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۱۴۴

کہہ دو میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس
کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون
یا سؤر کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ
کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔ ۹۰ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے۔ نہ چاہنے والا بنے اور

---

۸۸ اہل عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض اقسام کے پالتو مویشیوں کو حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ یہاں ان میں سے نر و مادہ دونوں کو لے کر ایک ایک سے متعلق سوال کیا ہے کہ بتاؤ ان میں سے نر حرام ہے یا مادہ یا مادہ کے پیٹ کا بچہ۔ پھر مطالبہ کیا ہے کہ کسی سند سے ثابت کرو کہ ان چوپایوں میں سے کوئی ایک بھی ملت ابراہیم میں حرام تھا۔ جب یہ حرام نہیں تھے تو انہیں کی نسل سے پیدا ہونے والے جانوروں میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کس طرح بن جائے گا؟ آخر ایک ہی درخت کے کچھ پھل جائز اور کچھ ناجائز کیسے ہو سکتے ہیں؟

۸۹ علم سے مراد یہاں علمی دلیل ہے جو دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دینِ ابراہیم کی کوئی قابلِ اعتماد سند ہو یا کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ ہو جس سے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے۔ مشرکین عرب کے پاس ایسی کوئی علمی دلیل نہ تھی جس سے وہ اپنے توہمات کے حق میں استدلال کر سکتے۔

۹۰ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ مویشیوں کے بارے میں تمہاری ان خانہ ساز حرمتوں کے برعکس ملتِ ابراہیم میں مردار جانور، بہایا ہوا خون، سور کا

اور حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۴۵
اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے
اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا
کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو سزا دی ۹۱ اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس
اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمہارا رب بڑی رحمت والا ہے اور اس کا
عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا۔ ۱۴۷
جنہوں نے شرک کیا وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ
ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے ۹۲ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے

گوشت اور وہ جانور حرام ٹھہرایا گیا تھا جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان میں سے سابق الذکر تین چیزوں کی حرمت ان کی ظاہر نجاست کی بنا پر ہے اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کی حرمت باطنی نجاست کی بنا پر ہے۔ یاد رہے کہ آیت کا ضابطہ صرف ملت ابراہیم کے احکام کی تعبیر کے طور پر ہے۔ اس کو اسلام کے عام ضابطۂ حلت و حرمت کی حیثیت دینا صحیح نہیں۔

۹۱ بنی اسرائیل پر ناخن والے جانور اور چربی کی حرمت اس وجہ سے نہیں تھی کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود ہے بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فسادِ مزاج کو تھا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت سخت قوانین میں باندھا۔ ملت اسلام کے احکام ایسی تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہیں۔

۹۲ مشرکین کی یہ بات ایک احمقانہ معارضہ ہے۔ انسانوں کو قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ قول یا فعل عند اللہ بھی صحیح ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر احمق اپنی حماقت کے جواز میں، ہر ظالم اپنے ظلم کی حمایت میں اور ہر بدمعاش اپنی بدمعاشیوں کے حق میں پیش کر سکتا ہے۔ خدا کی پسند یا ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ علمی سند یا عقل و فطرت کی شہادت ہے۔

بھی جو ان سے پہلے گزرے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو تمہارے پاس ہے اس کی کوئی سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو۔ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ کے لئے تو بس حجت ہے پہنچ جانے والی اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔[93] کہو، لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شاہد ہیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو[94] اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہم سر ٹھہراتے ہیں ۔ ۱۵۰

کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمہارے رب نے حرام کی ہیں[95] وہ یہ ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی[96] اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر

---

[93] مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس تو محض ظن اور گمان ہے مگر اللہ کے پاس عقل و دل میں اتر جانے والی دلیلیں ہیں، ہدایت حاصل کرنے کی راہ یہی دلیلیں ہیں۔ خدا اپنی مشیّت کے زور سے کسی کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

[94] معقول گواہی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذاتی مشاہدہ اور شخصی علم و واقفیت پر یا کسی عقلی یا فطری قرینہ پر مبنی ہو۔ اس کے بغیر جو گواہی ہو وہ محض ہرزہ سرائی ہوگی۔ اس لیے اس کے قبول کرنے سے منع کر دیا۔

[95] یہ اصل ملتِ ابراہیمی کا تفصیلی بیان ہے۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ تم بے سروپا روایات کے تحت چند چیزوں کو ملت ابراہیمی کے تحت حرام سمجھے بیٹھے ہو لیکن اس میں خدا اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق جو باتیں حرام بتائی گئی ہیں ان کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ آؤ میں تمہیں ان سے باخبر کروں۔

[96] اہل عرب میں قتلِ اولاد کا تعلق مشرکانہ توہمات اور لڑکیوں کے بارے میں غیرت

ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لیے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سنِ رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[97] اور جب تم بولو تو عدل کی بات کرو، خواہ کوئی تمہارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ اس کے غضب سے بچو۔ ۱۵۳

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے، اس پر جو خوب کار تھا[98] اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب

کے غلو کے علاوہ فقر و فاقہ کے اندیشہ سے بھی تھا۔ اس اندیشہ کا سبب ان کی یہ جہالت تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنے متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھے تھے۔ یہی غلط فہمی دورِ حاضر کے انسان کو ہے۔ بلکہ اس کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں بھی ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کے پیچھے اجڈ اور گنوار عربوں ہی کا فلسفہ کام کر رہا ہے۔

[97] آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بات ہماری صوابدید پر منحصر ہے کہ ہم اپنی طاقت و استطاعت کی حد خود مقرر کریں اور خدا کے احکام و شرائع میں سے انتخاب کر کے بعض کو قبول کر لیں اور باقی کو چھوڑ دیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام انسان کی صلاحیتوں کو تول کر دیئے گئے ہیں۔ کوئی چیز اس کے تحمل سے باہر نہیں ہے اس لیے چاہئے کہ وہ دیانت و صداقت کے ساتھ ان کی تعمیل کرے۔ بھول چوک کو اللہ تعالیٰ معاف کرے گا۔

[98] یعنی موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا سزاوار گردانا تو اس لیے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق پہچانا اور اس کو نہایت خوبی سے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی خوب کاروں کو اپنے منصب نبوت کے لیے منتخب کرتا اور ان پر اپنی نعمت کی تکمیل کرتا ہے۔

کی ملاقات پر ایمان لائیں ۞ ۱۵۴

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے ۞ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے ۞ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں۹۹۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت بُرا عذاب دیں گے ۞ وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو ہم بھی منتظر ہی ہیں ۞ ۱۵۸

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ۱۰۱ بن گئے تمہارا ان سے کوئی

---

۹۹ یہاں خطاب اہل عرب سے ہے۔ ان آیات میں اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا ہے جو اس قرآن کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پر کیا۔ یہ تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ کتاب اتار کر اللہ نے تم پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اب کوئی بد بخت آدمی ہی اس کتاب کو جھٹلا اور لوگوں کو اس سے روک سکتا ہے۔

۱۰۰ یعنی اگر کتاب الٰہی کو ماننے کے لیے عذاب کی آمد کے منتظر ہو تو یاد رکھو کہ عذاب الٰہی کے ظہور کے بعد جو ایمان لایا جاتا ہے وہ نافع نہیں ہوا کرتا۔ سود مند ایمان وہی ہے جو اس سے پہلے لایا جائے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کر لی جائے۔

۱۰۱ تفرقہ ڈالنے والوں سے مراد بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اصل ملت ابراہیم کی تعلیم میں بدعتیں پیدا کر کے مختلف پگڈنڈیاں نکال لیں۔ بنی

سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو جمع کریگا پھر انہیں بتائے گا۱۰۲ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں ۞ جو نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اسی کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا ۞ ۱۶۰

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے رستے کی طرف فرما دی ہے۔ دینِ قیم ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے ۞ کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۱۰۳ ۞ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں ۞ پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بناؤں جبکہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے۱۰۴ اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا۔ پس وہ تمہیں بتائے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے رہے ۞ اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا اس میں تم کو آزمائے۱۰۵۔ بے شک تیرا رب جلد پاداشِ عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے ۞ ۱۶۵

اسمٰعیل نے شرک و بت پرستی کی راہ اختیار کر لی اور بنی اسرائیل نے یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے کھڑے کیے۔ اس طرح اصل شاہراہ گم ہو گئی۔

۱۰۲ بتانے سے مراد اس کی رپورٹ سنانا نہیں بلکہ اس کا لازم یعنی عمل کے لحاظ سے جزا و سزا دینا ہے۔

۱۰۳ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملتِ ابراہیم اور ملت اسلام کی اصل روح کی تعبیر کرائی گئی ہے۔ جو اس ملت پر ہے وہ جیتا ہے تو خدا کیلئے اور مرتا ہے تو خدا کیلئے۔ اسکی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثناء کے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہوتی ہے۔

۱۰۴ یہ اس اسلام اور اس سرفگندگی و سپردگی کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کا اظہار اوپر کی آیت میں ہے۔

۱۰۵ یہ قریش کو آخری تنبیہہ ہے کہ تم پہلی قوم نہیں ہو جو دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہو۔ تم سے پہلے بھی قومیں آچکی ہیں اور اپنی سرکشیوں کے نتیجہ میں کیفر کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر ان کے جانشین ہو کر تم نے بھی وہی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارے معاملے میں سنتِ الٰہی بدل جائے۔

اسالیبِ قرآن ۳

خالد مسعود

فصل

اوپر کے مباحث میں دو جملوں کی ترکیب کے وہ قواعد بیان کیے گئے جن میں حرفِ عطف استعمال ہوتا ہے یا نہیں ہوتا لیکن جملوں میں وصل ہوتا ہے۔ وصل کا انحصار دونوں جملوں کی یکسانی اور ہم آہنگی پر ہوتا ہے۔ جو ان میں صورت یا معنی کے لحاظ سے پائی جاتی ہے۔ دو جملوں کے درمیان جب حرفِ عطف نہ لایا جائے تو یہ صورت فصل کہلاتی ہے۔ اس کے دو خاص اور ایک عام مواقع ہیں۔

فصل کا پہلا خاص موقع وہ ہوتا ہے جب دو جملوں میں کامل وحدت اور معنی کی ایسی یکسانی پائی جائے کہ ایک جملہ دوسرے جملہ کی جگہ لے سکے۔ یہ شکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل یا اس کی وضاحت یا اس کی تاکید ہوتا ہے۔ اس کو مثالوں سے واضح کرنا مفید رہے گا۔ حسبِ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

۱- اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ (الشعرا ۱۳۲ - ۱۳۳)

اس نے ان چیزوں سے تمہیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمہاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے۔

اس آیت میں دونوں جملے جو اَمَدَّكُمْ سے شروع ہوتے ہیں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے اہل ہیں یعنی دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل ہے اس لیے اس پر حرفِ عطف نہیں آیا۔

۲- قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ (المومنون ۸۱ - ۸۲)

انہوں نے بھی وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی تھی۔ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سرِ نو اٹھائے جائیں گے!

یہاں قَالُوْا سے شروع ہونے والا دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل ہے اس لیے دونوں

جملوں میں فصل ہے۔

۳- يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (البقرہ ۴۹)

وہ تمہیں برے عذاب چکھاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے۔

اس آیت میں يُذَبِّحُوْنَ سے شروع ہونے والا جملہ اس عذاب کی نوعیت کی وضاحت کرتا ہے جو پہلے جملے میں مذکور ہے۔ اس طرح کی وضاحت بھی کلام میں فصل کا تقاضا کرتی ہے یہ آیت سورہ ابراہیم میں بھی آئی ہے اور وہاں يُذَبِّحُوْنَ سے پہلے حرفِ عطف ہے جس کا تقاضا وہاں یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ فرعون متنوع طریقوں سے بنی اسرائیل کو عذاب میں مبتلا کرتا تھا۔ ان میں سے خاص طریقہ کا عذاب وہ تھا جس میں وہ ان کے لڑکوں کو قتل کر کے اور لڑکیوں کو زندہ رکھ کے مبتلا کرتا تھا۔

۴- فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ ۱۱۹ - ۱۲۰)

تو شیطان نے اس کو ورغلایا۔ کہا کہ اے آدم، کیا میں تمہیں زندگیِ دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے۔

یہاں قَالَ سے آگے کے جملہ نے شیطان کے اس وسوسہ کو کھول دیا ہے۔ جس کی طرف پہلے جملہ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ یعنی شیطان نے آدم کو جو فریب دیا وہ یہ تھا کہ اس نے ان کو بہتر مستقبل کا لالچ دے کر ورغلایا۔

۵- مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۳-۴)

وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

۶- مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف ۳۱)

یہ آدمی نہیں، یہ تو کوئی فرشتہ قدسی ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اِنْ سے شروع ہونے والا دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں پہلے جملہ ہی کے مضمون کو دوسرے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کمال یکسانی کے باعث دونوں جملوں میں فصل ہے یعنی حرف عطف نہیں آیا۔

۷۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا کَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَیْہِ وَقْرًا (لقمان ۷)

اور جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض کرتا ہے گویا ان کو سنا ہی نہیں۔ گویا اس کے کانوں میں بہرہ پن ہے۔

اس آیت میں کَاَنَّ سے آگے کا جملہ بیچ کے الفاظ کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا کی تائید مزید کے لیے آیا ہے۔ یہ کامل وحدت فصل کی مقتضی ہوتی ہے۔

فصل کا دوسرا خاص موقع وہ ہوتا ہے جب دو جملوں میں مذکورہ نوعیت کا کامل اتحاد تو نہ ہو لیکن اس سے مشابہ کوئی اور ربط پایا جائے۔ اس مشابہت کی ایک عام شکل یہ ہے کہ پہلے جملہ سے کوئی سوال مفہوم ہوتا ہو جس کا جواب دوسرے جملہ میں فراہم کیا جائے۔ مثلاً سورۂ یوسف کی آیت ہے۔

وَمَآ اُبَرِّیُٔ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف ۵۳)

"اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا، نفس تو برائیوں ہی کی راہ سجھانے والا ہے۔"

یہاں آیت کے پہلے حصہ سے یہ سوال مترشح ہوتا ہے کہ جب الزام زنانِ مصر پر درست ثابت ہوگیا تو اب یوسفؑ اپنی ذات کو کیوں بری الذمہ قرار نہیں دیتے۔ آیت کا دوسرا حصہ اس کا سبب بیان کر رہا ہے کہ نفس کو کیسے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا تو کام ہی برائی کا مشورہ دینا ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً قَالُوْا لَا تَخَفْ (الذاریات ۲۸)

تو اس نے ان سے ایک قسم کا اندیشہ محسوس کیا۔ انہوں نے کہا تم اندیشہ ناک نہ ہو۔

اس آیت میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے دل میں جو خوف پیدا ہوا وہ اس امر کا متقاضی تھا کہ ان کے مہمان یہ بتائیں کہ وہ کون ہیں اور ان کی آمد کا سبب کیا ہے۔ جملۂ ثانی اس سوال کا جواب مہیا کرتا ہے۔ لہٰذا دونوں جملوں میں فصل ہے۔

فصل کا تیسرا اور عام موقع جس سے قرآن مجید کے ایک طالب علم کو کثرت سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ ہے جس میں یا تو سورہ کا ایک بالکل نیا مضمون شروع ہو رہا ہو یا

آیات میں اس طرح کا ربط ہو جس طرح کا ربط دعویٰ اور اس کی دلیل میں، سوال اور اس کے جواب میں۔ سبب اور اس کے نتیجہ میں اور عمل اور اس کے انجام میں ہوتا ہے یا جب دو آیتیں ایک بات کے دو مختلف پہلوؤں کو سامنے لا رہی ہوں۔ اس طرح کے موقع پر آیات کے سیاق و سباق پر غور کر کے متعین کرنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین ربط کی نوعیت کیا ہے۔

فصل کی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہر شخص خود فراہم کر سکتا ہے۔ محض مثال کے لیے ہم سورہ اللہب کا حوالہ دیتے ہیں۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ○ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ ○ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ○ وَّامْرَاَتُہٗ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ○ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گیا۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔

یہاں پہلی آیت سے ایک مضمون کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا حرف عطف کی ضرورت نہیں۔ اس میں ابولہب کے اقتدار کے زوال اور اس کی اپنی ذات کے خاتمہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ دوسری آیت میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ ابولہب نے اپنی زندگی کا مقصد جو جمع مال کا بنایا اور اس کی خاطر وہ خبثِ باطن کے ساتھ بظاہر بیت اللہ کی خدمت بھی کرتا رہا، یہ چیزیں اس کو کوئی تحفظ نہ دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا نیا مضمون ہے کہ جو پہلی آیت کی جگہ لینے کا اہل نہیں۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں فصل ہے۔ تیسری آیت میں ابولہب کا وہ انجام بتایا ہے جس سے وہ آخرت میں دوچار ہونے والا ہے۔ یہ مضمون بھی نیا ہونے کے باعث فصل کا متقاضی ہے۔ البتہ تیسری اور چوتھی آیت میں یہ اشتراک موجود ہے کہ چوتھی آیت ابولہب کی بیوی کو ابولہب ہی کے انجام میں شریک کر رہی ہے اس لئے یہاں حرفِ عطف موجود ہے۔

معنوی فصل:-

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ کلام ایک خط مستقیم

میں چلتا چلتا یک لخت ایک مختلف رُخ اختیار کرلیتا ہے۔ پہلے ایک ہی بات کے کئی پہلو یکے بعد دیگرے سامنے آرہے ہوتے ہیں لیکن ایک مقام پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے اس کا رُخ موڑ دیا ہو۔ مزید آگے بڑھیں تو پھر پہلے مضمون سے کڑیاں ملنی شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ مقام جہاں سے مضمون مختلف رخ اختیار کرتا ہے، معنوی فصل کا موقع ہوتا ہے۔ اس پر سیاق و سباق کی روشنی میں غور کرکے متعین کرنا پڑتا ہے کہ کلام کی تبدیلی کے اسباب کیا ہیں۔ معنوی فصل کے چند اہم اسباب حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ کلام کا ایک مخاطب سے دوسرے مخاطب کی طرف مڑجانا۔ ظاہر ہے کہ بات ہمیشہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق اور اس کی ضرورت کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے مخاطبین مشرک بھی ہیں اہل کتاب بھی۔ اس کا خطاب کبھی مسلمانوں سے بحیثیت مجموعی ہوتا ہے اور کبھی ان کے کسی خاص طبقہ سے۔ کبھی خطاب کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک موضوع پر کلام کرتا ہے تو ان میں سے ہر مخاطب کو وہ بقدرِ ضرورت مخاطب کرتا ہے۔ ایک ایسا قاری جو کلام کے اس تنوع کو نہ سمجھتا ہو وہ تبدیلیٔ خطاب سے پریشان ہوکر رہ جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ قرآن میں ربط نہیں۔ حالانکہ یہ موقع معنوی فصل کا ہوتا ہے۔ اس کو ہم آگے التفات کے اسلوب کے تحت بیان کریں گے۔

۲۔ کلام میں جملۂ معترضہ کا داخل ہونا۔ ایسا جملہ سلسلۂ کلام کو منقطع کرکے برسرِموقع کسی حقیقت کی یاد دہانی، کسی غلط دعوٰی کی تردید یا بات سننے والے کے ذہن میں پیدا ہونے والے شک کو دور کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہم آگے جملۂ معترضہ کے عنوان کے تحت کریں گے۔

۳۔ عربی زبان میں بسا اوقات کلام کا کچھ حصہ حذف کردیا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاق و سباق کی مدد سے ایک ذہین قاری پر خود بخود واضح ہورہا ہوتا ہے۔ اس کو کلام میں کھولنا فصاحت و بلاغت کے خلاف ہوتا ہے۔ جو شخص عربی کے اس اسلوب کو نہ جانتا ہو وہ حذف کے مواقع پر کلام کو غیر مربوط اور غیر متصل سمجھنے لگتا ہے۔ حذف کے اسلوب پر بھی ہم آگے روشنی ڈالیں گے۔

۴۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو مضمونوں کو کسی ایسی باہمی مناسبت کی بنا پر جمع کردیا جاتا ہے جس کی طرف عام آدمی کا ذہن فوراً منتقل نہیں ہوتا اور وہ کلام کو بے ہنگم سمجھتا ہے لیکن

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

امین احسن اصلاحی

موطا کی کتاب الزکوٰۃ کی حدیث

جانوروں کی زکوٰۃ

۱۹۔ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ اَبِی صَالِحِ السَّمَّانِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ مَالٌ لَمْ یُؤَدِّ زَكَاتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِیْبَتَانِ یَطْلُبُهٗ حَتّٰی یُمْكِنَهٗ یَقُوْلُ لَهٗ اَنَا كَنْزُكَ۔

□ ۰۰۰ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ جس کے پاس مال رہا ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو اس کا مال قیامت کے روز ایک گنجے زہریلے سانپ کی مانند ہوگا جس کی آنکھوں کے پاس نقطے کی طرح نشان ابھرے ہوں گے وہ اس کو طلب کررہا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اس کو قابو میں کرلے گا اور کہے گا میں ... جناب کا مال۔

حضرت ابوہریرہؓ کی رائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے کے مثل ہے۔ میری رائے میں مال کی ساری برکتیں انفاق سے ہیں۔ سورۂ مزمل میں ہے کہ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا) اگر زکوٰۃ ادا کرنے پر مال کا حق ادا ہوجاتا تو اٰتُوا الزَّكٰوةَ کے بعد اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ یہ بات درست ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا ہوجانے کے بعد حکومت اس میں مداخلت نہیں کرسکتی لیکن اللہ تعالیٰ کے حقوق ختم نہیں ہوتے۔

میرے نزدیک مال کو جمع کرکے رکھنا ناجائز ہے۔ کاروباری دولت جائز ہے اس لیے کہ وہ معاشرے کا حق ادا کررہی ہے، وہ ہر وقت خطرے میں ہوتی ہے۔ مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتی ہے اور لوگوں کو ضرورت کی چیزیں مہیا کررہی ہوتی ہے۔ جو دولت بنک میں یا تجوریوں میں جمع ہے یا زمین میں گاڑی ہوئی ہے وہ سب کنز کے تحت آتی ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ کا یہی مذہب ہے اور قرآن کے مطابق ہے۔

۲۰۔ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ: قَرَأْتُ كِتَابَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي الصَّدَقَةِ۔ قَالَ فَوَجَدْتُ فِيهِ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ كِتَابُ الصَّدَقَةِ: فِي أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ مِنَ الْإِبِلِ فَدُونَهَا الْغَنَمُ، فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلَاثِينَ ابْنَةُ مَخَاضٍ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ ابْنَةُ مَخَاضٍ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى سِتِّينَ حِقَّةٌ طَرُوقَةُ الْفَحْلِ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِينَ جَذَعَةٌ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى تِسْعِينَ ابْنَتَا لَبُونٍ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ حِقَّتَانِ طَرُوقَتَا الْفَحْلِ فَمَا زَادَ عَلَى ذٰلِكَ مِنَ الْإِبِلِ فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حِقَّةٌ، وَفِي سَائِمَةِ الْغَنَمِ إِذَا بَلَغَتْ أَرْبَعِينَ إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاةٌ، وَفِي مَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى مِائَتَيْنِ شَاتَانِ، وَفِيمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلَى ثَلَاثِمِائَةٍ ثَلَاثُ شِيَاهٍ، فَمَا زَادَ عَلَى ذٰلِكَ فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ، وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ تَيْسٌ، وَلَا هَرِمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ إِلَّا مَا شَاءَ الْمُصَدِّقُ، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُفْتَرِقٍ، وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ، وَفِي الرِّقَةِ إِذَا بَلَغَتْ خَمْسَ أَوَاقٍ رُبُعُ الْعُشْرِ۔

□ ۰۰۰۰ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ کا خط پڑھا تو وہ یوں تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الصدقہ۔ چوبیس یا اس سے کم اونٹوں پر ہر پانچ اونٹ کے لئے ایک بکری اور اس کے اوپر ۳۵ اونٹوں تک اونٹنی کا وہ مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو یا کچھ زیادہ اور اگر ایسا بچہ نہ ہو تو وہ بچہ جو تیسرے سال میں ہو اور نر ہو۔ اور اس سے اوپر ۴۵ تک تین سال کا مادہ بچہ اور اس سے اوپر ساٹھ تک جوان اونٹنی جو حاملہ ہونے کے قابل ہو اور اس سے اوپر ۷۵

تک جوان اونٹ اور اس سے اوپر ۹۰ تک تین سال کے دو مادہ بچے۔ اور اس سے اوپر ۱۲۰ تک دو جوان اونٹنیاں حاملہ ہونے کے قابل۔ اور اس کے اوپر جو اونٹ زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر ایک تین سال کا مادہ بچہ اور ہر پچاس پر ایک جوان اونٹنی۔ اور بکریوں میں جب ان کی تعداد چالیس تک پہنچ جائے تو ۱۲۰ تک ایک بکری اور اس سے اوپر ۲۰۰ تک دو بکریاں اور اس سے اوپر ۳۰۰ تک تین بکریاں اور اس سے اوپر ہر ایک سو پر ایک بکری۔ اور صدقے میں سانڈ بکرا۔ بوڑھی اور عیب دار بکری یا اونٹنی نہیں لی جائے گی مگر یہ کہ تحصیل دار چاہے اور زکوٰۃ کے ڈر سے نہ الگ الگ گلوں کو یکجا کیا جائے گا اور نہ مجتمع گلوں کو الگ الگ کیا جائے گا اور جو خلیطین کے درمیان ہوگی تو وہ آپس میں برابر تقسیم کرلیں گے اور چاندی جب پانچ اوقیہ ہو تو اس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی۔

" ابنۃ مخاض "۔ اونٹ کا مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو لیکن ابھی تیسرے میں داخل نہ ہوا ہو۔

" ابنُ لَبُون " اونٹ کا وہ نر بچہ جو تیسرے سال میں ہو۔

" حِقّة " جوان اونٹنی۔

" طَرُوقَةُ الفَحْلِ " وہ اونٹنی جو حاملہ ہونے کی صلاحیت کو پہنچ جائے۔

" جَذَعَة " جوان اونٹ۔

" تَيس " سانڈ جو تناسل کے لئے پالا جاتا ہو۔

" هَرِمَة " بوڑھی اونٹنی یا بکری۔

" ذَاتُ عَوَارٍ " عیب دار یعنی ایک آنکھ یا کان یا سینگ یا ٹانگ خراب ہو وغیرہ۔

" خَلِيطَيْنِ " جب دو یا زیادہ مالکوں کا مال ممیز ہو لیکن گھاٹ، غلہ، سانڈ، ڈیرہ اور چرواہا ایک ہی ہو تو وہ خلیط کے حکم میں ہیں۔ مال ممیز نہ ہو تو شریک ہوں گے۔

" رِقَة " چاندی کو کہتے ہیں۔

یہ روایت اگرچہ موقوف کے درجے میں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی رُو سے کہ عليكم بسُنّتي وسنة الخُلَفاءِ الرَّاشدين (میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا) اس کو سنت کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے خط کے مندرجات ہیں اور اس لحاظ سے یہ ہدایات اسلامی نظام کا جزو ہیں۔

اونٹوں کا نصاب پانچ اونٹ ہے جس کی زکوٰۃ ایک بکری ہے۔ جوں جوں اونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا زکوٰۃ کے جانور کی نوعیت بدلتی جائے گی جو روایت میں بالکل واضح ہے۔ اونٹوں یا

بکریوں کے شمار میں ان کا بڑا یا چھوٹا ہونا خارج از بحث ہے۔

مالکیہ کے نزدیک اگر زکوٰۃ دینے والے کے پاس مطلوبہ قسم کی اونٹنی گلے میں موجود نہ ہو تو اس کو خرید کر دینی پڑے گی۔ دوسرے فقہا کا بھی یہی مسلک ہے۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ مطلوبہ قسم کی اونٹنی کی نایابی کی صورت میں اس کی بازاری قیمت زکوٰۃ میں ادا کی جا سکتی ہے۔ نبی کریمؐ نے حضرت معاذؓ کو یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ غلے میں سے غلہ اور جانوروں میں سے جانور لو تو وہ درحقیقت لوگوں کی سہولت کے پیش نظر فرمائی تھی کیونکہ صحرائی زندگی میں نقد ادائیگی مشکل تھی۔ اب اگر سہولت نقد ادائیگی میں ہے تو واجبی دام زکوٰۃ میں لیں گے اور زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غلے اور مواشی کی بجائے ان کی نقد قیمت زکوٰۃ میں ادا کر دیں۔ قیمت کا تعین تحصیلدار کرے گا۔ اگر زیادتی کرے گا تو اوپر شکایت کی جا سکتی ہے۔

اِلَّا مَا شَاءَ الْمُصَدِّقُ کا تعلق صرف "ذَاتُ عَوَارٍ" سے ہے۔ تیسؓ اور ہرمۃؓ سے نہیں۔ عیب اگر معمولی قسم کا ہو اور جانور کی قیمت پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوتا ہو تو ایسا جانور صدقہ میں لے لیا جائے گا۔ یہ تحصیلدار کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ سانڈ کو اس لئے نہیں لیا جائے گا کہ گلے کی نشوونما کا انحصار اس کے اوپر ہے۔

میرے نزدیک تحصیلدار چھانٹ کر اچھے جانور نہیں لے سکتا۔ جس نسل یا قسم کے جانور زیادہ تعداد میں ہوں گے ان ہی میں سے لے گا۔

اگر زکوٰۃ دینے والے کے کئی گلے الگ الگ ہوں تو وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیۓ ایک جگہ شمار نہ ہوں گے اور نہ ہی ایک جگہ کے اکٹھے گلوں کو زکوٰۃ کے لئے الگ کیا جائے گا۔

امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس دو الگ الگ چرواہوں کی نگرانی میں بکریاں ہوں یا الگ الگ چرواہوں کی نگرانی میں الگ مقامات یا شہروں میں ہوں تو مالک کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ ان کی زکوٰۃ دے گا۔ میرے نزدیک اگر ایک تحصیلدار کے حلقے میں ایسا ہو تو جمع کی جا سکتی ہیں لیکن اگر تحصیلدار الگ ہوں تو ایسا کرنا باعث زحمت ہے۔ اس لئے ان کو الگ الگ رکھنا چاہئے۔

خلیط ہونے کی صورت میں ہر مالک پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس کے گلے کی تعداد بقدر نصاب ہوگی۔ اگر کسی ایک خلیط کے گلے کی تعداد نصاب سے کم ہوگی تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ لیکن اگر گلے میں کئی شخص شریک ہوں تو جانوروں کی کل تعداد پر زکوٰۃ لی جائے گی جس کو شریک آپس میں شراکت کے تناسب سے تقسیم کر لیں گے۔

احناف کا مسلک بھی یہی ہے لیکن اہلِ حدیث اور شوافع کہتے ہیں کہ کل گلے کی تعداد پر زکوٰۃ عائد ہوگی چاہے خلیط ہوں یا شریک۔ میرے نزدیک احناف اور مالکیہ کا مسلک صحیح ہے۔ جب مال معین ہو تو اس کی تعداد کے لحاظ سے نصاب کا تعین ہوگا۔ جب مال معین نہ ہو تو شراکت کے اصول کے تحت زکوٰۃ عائد ہوگی۔ شوافع کا مسلک کہ ہر شکل میں کل مال کے حساب سے زکوٰۃ لی جائے گی درست نہیں۔

وَفِي كِتَابِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، وَفِي سَائِمَةِ الْغَنَمِ إِذَا بَلَغَتْ أَرْبَعِينَ شَاةً شَاةٌ۔

□ ... اور حضرت عمر بن خطابؓ کے خط میں ہے کہ چرنے والی بکریاں جب چالیس ہو جائیں تو ان میں سے ایک بکری زکوٰۃ میں لی جائے گی۔

امام مالکؒ کا فتوے یہ ہے کہ اگر بھیڑیں بکریوں سے زیادہ ہوں اور صاحب مال پر ایک بکری سے زیادہ زکوٰۃ واجب نہ ہوتی ہو تو تحصیلدار ان بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ لے لے گا۔

اور اگر بکریاں بھیڑوں سے تعداد میں زیادہ ہوں تو وہ ایک بکری لے گا اور اگر بھیڑ بکریاں تعداد میں برابر ہوں تو یہ تحصیلدار کی صوابدید پر ہوگا کہ بکری لے یا بھیڑ۔ یہی معاملہ اونٹوں کی مختلف اقسام جمع ہونے کی صورت میں ہوگا۔ میرے نزدیک یہ فتوے نہایت معقول ہے اور ہر نوع کے جانوروں کی زکوٰۃ میں اسی کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

حضرت عمرؓ کا فرمان انہی جانوروں کے بارے میں ہے جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں پالے جاتے تھے۔ اب صورت حال میں یہ فرق واقع ہوگیا ہے کہ ان کے علاوہ کئی انواع کے جانوروں کے فارم اور اصطبل قائم ہو چکے ہیں۔ ان جانوروں کا کاروبار نہایت منافع بخش ہے۔ میرے نزدیک ایک اسلامی حکومت ان تمام جانوروں پر جو تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں زکوٰۃ عائد کرے گی۔

۲۱ ۔ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ طَاوُسٍ الْيَمَانِيِّ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ الْأَنْصَارِيَّ

أَخَذَ مِنْ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعًا وَمِنْ أَرْبَعِيْنَ بَقَرَةً مُسِنَّةً وَأُتِيَ بِمَا دُوْنَ ذَالِكَ فَأَبَى أَنْ يَّأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا، وَقَالَ لَمْ أَسْمَعْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ شَيْئًا حَتّٰى أَلْقَاهُ فَأَسْأَلَهُ فَتُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ أَنْ يَقْدَمَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ۔

□ ... طاؤس الیمانی روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل انصاریؓ نے تیس گائے بیل میں سے ایک بچہ لیا جس نے دودھ پینا ابھی چھوڑا تھا۔ اور چالیس گائے بیل میں ایک دوسالہ بچھڑی بطور زکوٰۃ وصول کی۔ اس تعداد سے کم گائے بیل لائے گئے تو انہوں نے کچھ لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ میں نے رسولؐ اللہ سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔ اس لئے میں اس وقت تک کچھ نہیں لوں گا جب تک کہ میں رسول اللہؐ سے نہ ملوں اور ان سے پوچھ لوں ~~معاذ~~ بن جبل کے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضورؐ کا انتقال ہوگیا۔

"تبیع" اس بچے کو کہتے ہیں جس نے دودھ پینا چھوڑدیا ہو۔

"مُسِنّۃ" اس دوسالہ بچھڑی کو کہتے ہیں جو بلوغ میں داخل ہو رہی ہو۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے بیل کا نصاب تیس گائے بیل ہے اور بھیڑ بکری کا چالیس ہے۔ آج کل گائے بیل کی ترقی یافتہ نسلیں ہالینڈ اور آسٹریلیا سے درآمد کی جاتی ہیں۔ ساہیوال کی بھینسیں اور بعض علاقوں کے گائے بیل خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی زکوٰۃ لیتے وقت تحصیلدار خیال رکھے گا کہ جس نسل کی تعداد زیادہ ہوگی اسی میں سے زکوٰۃ لے گا جیسا کہ اوپر کی روایت میں بیان ہوچکا ہے۔

امام مالکؒ کے فتوے

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس بھیڑیں بھی ہوں اور بکریاں بھی تو دونوں کو جمع کرکے

زکوٰۃ لی جائے گی کیونکہ وہ سب غنم کے حکم میں ہیں۔ میرے نزدیک یہ درست ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گلے میں اضافہ کرے خواہ خرید کر یا جانوروں کی افزائش سے یا میراث ملنے سے تو ان پر سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ شخص پہلے ہی صاحب نصاب ہے تو وہ اضافہ شدہ جانوروں کی زکوٰۃ پہلے جانوروں کے ساتھ دے گا۔ اگرچہ اس کو یہ جانور زکوٰۃ دینے کے ایک ہی روز پہلے ملے ہوں یا خریدے ہوں۔

امام مالکؒ کے نزدیک اونٹ جو رہٹ چلاتے ہوں اور بیل جن پر پانی کی مشکیں لاد کر لائی جاتی ہوں اور جو کھیتی کے کام آتے ہوں اگر وہ نصاب کی تعداد میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ لی جائے گی۔ مثلاً اگر ایک اونٹ رہٹ چلاتا ہے اور دوسرے پالے ہوئے ہیں اگر یہ مل کر پانچ ہو جائیں تو زکوٰۃ لی جائے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اونٹ کے ساتھ سائمہ کا ذکر نہیں کیا، صرف بکری کے ساتھ کیا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قرین صواب یہ ہے کہ بکری پر دوسرے جانوروں کو قیاس کیا جائے۔ نیز زکوٰۃ میں ایک اصول یہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ پہننے کے کپڑوں اور استعمال کے زیوروں پر زکوٰۃ نہیں۔ مزید برآں زکوٰۃ ان چیزوں پر ہے جن کی نشوونما ہوتی ہو۔ وہ اونٹ یا بیل جو رہٹ چلاتا ہو یا باربرداری کے کام آتا ہو وہ نشوونما کے مقصد کے لئے بیکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی مدد سے جس چیز کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس میں سے زکوٰۃ الگ لی جا رہی ہے، اگر اونٹ رہٹ چلاتا ہے تو فصل میں اس کی محنت جذب ہو رہی ہے اور فصل میں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہے اس لیے جو جانور استعمال کے ہیں وہ زکوٰۃ کے اموال میں نہیں آتے۔ مالکیہ استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہیں تو استعمال کے جانور بھی اسی اصول کے تحت زکوٰۃ کے اموال سے الگ ہونے چاہئیں۔

۲۲۔ حَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدٍ الدِّيْلِيِّ عَنِ ابْنِ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سُفْيَانَ الثَّقَفِيِّ عَنْ جَدِّهِ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بَعَثَهُ مُصَدِّقًا، فَكَانَ يَعُدُّ عَلَى النَّاسِ بِالسَّخْلِ، فَقَالُوا أَتَعُدُّ عَلَيْنَا بِالسَّخْلِ وَلَا تَأْخُذُ مِنْهُ شَيْئًا. فَلَمَّا قَدِمَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ذَكَرَ لَهُ ذَالِكَ. فَقَالَ عُمَرُ نَعَمْ

نَعُدُّ عَلَيْهِمْ بِالسَّخْلَةِ يَحْمِلُهَا الرَّاعِي، وَلَا تَأْخُذُهَا،
وَلَا تَأْخُذُ الْأَكُولَةَ، وَلَا الرُّبَّى، وَلَا الْمَاخِضَ
وَلَا فَحْلَ الْغَنَمِ، وَتَأْخُذُ الْجَذَعَةَ وَالثَّنِيَّةَ،
وَذَالِكَ عَدْلٌ بَيْنَ غِذَاءِ الْغَنَمِ وَخِيَارِهِ۔

☐ ... سفیان بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کو تحصیلدار بنا کر بھیجا۔ وہ زکوٰۃ کے لئے بکریوں کے بچوں کو بھی شمار کرتے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بکریوں کے بچوں کو شمار کر لیتے ہیں لیکن زکوٰۃ کے طور پر ان کو قبول نہیں کرتے۔ جب سفیان حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں تم بکری کے بچوں کو شمار کیا کرو بشمول ان کے جن کو چرواہا اپنے کندھے پر اٹھائے ہو (یعنی جو ابھی بکری کے ساتھ چل بھی نہ سکتا ہو) لیکن ان کو زکوٰۃ میں نہ لو۔ اور نہ ہی اس بکری کو لو۔ جو گوشت کھانے کے لیے تیار کی جا رہی ہو، نہ اس کو جو بچے کی پرورش کرتی ہو، نہ وہ جو حاملہ ہو اور نہ ہی سانڈ زکوٰۃ میں لیا جائے گا البتہ ایک سالہ اور دو سالہ بچے لیے جائیں گے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے عام بکریوں اور اعلیٰ بکریوں کے درمیان۔

"السَّخْلَة" بکری کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں۔
"اَلْاَکُوْلَۃُ" اس بکری کو کہتے ہیں جس کا گوشت کھانے کے لیے اس کو موٹا کیا جا رہا ہو۔
"الرُّبّٰی" وہ بکری جو بچہ جن چکی ہو اور اب اس کی پرورش کر رہی ہو۔
"الْمَاخِضَ" وہ حاملہ بکری جو بچہ جننے والی ہو۔
"الْفَحْلَ الْغَنَمْ" وہ سانڈ جو افزائش نسل کی غرض سے پالا جا رہا ہو۔

اس روایت کا مفہوم واضح ہے۔ اس کی رو سے اصول یہ ہے کہ بچے نصاب پورا کرنے کے لیے تو شمار کیے جائیں گے لیکن ان کو زکوٰۃ میں وصول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح سے وہ بکریاں جو کسی خاص مقصد کے لیے پالی جا رہی ہوں زکوٰۃ میں وصول نہیں کی جائیں گی۔ غذاءُ الْغَنَم سے عام بکریاں مراد ہیں اور خیارہ سے خاص اعلیٰ قسم کی بکریاں۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دونوں کے ایک سالہ اور دو سالہ بچے لیے جائیں گے۔

امین احسن اصلاحی

صحیح بخاریؒ

الجامع الصحیح حدیث کے جلیل القدر امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) کا عظیم کارنامہ ہے۔ ہر نوع کی تقریباً پانچ لاکھ حدیثوں کے انبار کی چھان پھٹک کر کے اس میں سے چند ہزار روایات اپنے مقرر کردہ معیارِ صحت پر منتخب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ امام صاحب ان روایات کی ترتیب و تہذیب میں سولہ برس صرف کر کے اپنی یہ کتاب منظرِ عام پر لائے۔ ان کی اس جاں گداز محنت اور دوسرے محدثین کے مقابل میں اعلیٰ معیارِ صحت کی بنا پر الجامع الصحیح کو قبولیتِ خواص و عوام اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے۔ یہ کتاب حدیث کی امہات میں سرِفہرست ہے۔ اس پر کسی شخص کی تدبر کی نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حدیث کے اہم بنیادی ذخیرے کے بیشتر حصہ پر اس کی نظر ہے۔ یہ کتاب علم کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ دین کے فہم یا دعوت و اصلاح کے کام میں اس کو نظر انداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

صحیح بخاری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا معیارِ سند موطا امام مالکؒ کے سوا باقی تمام مجموعہ ہائے حدیث سے عالی ہے۔ نیز سند کے معاملے میں امام بخاریؒ کے ہاں نسبتاً زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے۔ انہوں نے روایتِ حدیث میں راویوں کی ثقاہت کے علاوہ دو اور شرطیں مقرر کی ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث کا راوی اپنے شیخ کا معاصر ہو، دوسرے یہ کہ شیخ سے اس کا سماع بھی ثابت ہو۔ راوی کے لئے امام صاحب نے ثقاہت کا جو معیار مقرر کیا ہے اس کے مطابق سند کو پرکھ کر اور ان شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنی کتاب میں کسی روایت کو جگہ دیتے ہیں۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امام صاحب نے ان روایات کو زیادہ اہمیت دی ہے جن میں ایمان قول و عمل کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس انتخاب کا مزاج

کلامی ہے۔ کتاب الایمان کے بغور مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب کے وقت یہ پہلو پوری طرح سے امام صاحب کے پیشِ نظر رہا ہے کہ مرجئہ اور ان کے جتنے ہم مشرب گروہ ان کے زمانے میں تھے اور انہوں نے جو فتنے ان دنوں اٹھائے تھے ان کا قلع قمع کیا جائے۔ یہ لوگ ایمان کے محض زبانی اظہار کو اہمیت دیتے اور عمل کو نجات کے لیے ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ مرجئہ ہی کا مذہب آج اسلامی دنیا میں عملاً رائج ہے اور عمل کی وقعت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ صحیح بخاری اس نقطۂ نظر کی سخت مخالف ہے۔

اس مجموعہ حدیث کی تیسری خصوصیت اس میں روایات کا تکرار ہے۔ ایک ہی روایت بیشتر انہی الفاظ میں بار بار سامنے آتی ہے۔ اس تکرار سے بچنے ہی کے لیے تجرید بخاری جیسی کتابیں مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ امام صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے قائم کردہ ابواب کے الفاظ کی کسی ادنیٰ رعایت کے باعث ایسی احادیث اس کے تحت نقل کر دیتے ہیں جن کا محل معنی اور حکمت کے لحاظ سے کسی دوسرے باب میں ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ہی روایت تین تین چار چار ابواب میں نقل ہو کر تکرار پیدا کرتی ہے۔ اگر ایسی مکررات کو حذف کر دیا جائے تو کتاب کی ضخامت تقریباً نصف رہ جائے گی۔

امام صاحب کے مقرر کردہ عنوانات کا بھی ایک خاص مزاج ہے۔ وہ موضوع کے بعید ترین گوشوں پر چلے جاتے ہیں اور اخذِ مسائل کے لیے نہایت باریک استدلال کی راہ کھولتے ہیں۔ یہ چیز ان کے تفقہ کی دلیل ہے اور تربیتِ فکر کے پہلو سے اہم ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ یہ فقاہت امام صاحب کو بعض غیر ضروری مسائل کی طرف بھی لے گئی ہے۔ جس کی وضاحت تراجم ابواب پر بحث کرتے ہوئے ہم کریں گے۔

صحیح بخاری بغیر کسی مقدمہ، تمہید یا دیباچہ کے لکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ مؤطا کے طرز کی کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں کتابوں کا مقدمہ لکھنے کا رواج نہ تھا۔ امام مسلم نے اسی دور میں اپنا مجموعہ احادیث مرتب کیا اور اس پر بڑا شاندار مقدمہ لکھا جس میں روایتِ حدیث کے اصول پر نہایت مدلل بحث کی اور اپنے اصولوں کا دفاع کیا۔ امام بخاری یا تو مقدمہ لکھنے کے قائل نہیں رہے یا ان کو اس کی فرصت نہیں ملی۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ابواب کے عنوانات پہلے قائم کئے اور روایات بعد میں نقل کیں اس لیے بے شمار عنوانات ایسے رہ گئے جن کے تحت وہ کوئی روایت نہیں لا سکے۔ یا

روایات تو انہوں نے نقل کر دیں لیکن ترجمۂ باب سے ان کی مناسبت محلِ نظر معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں میں ان لوگوں کی رائے کو صائب سمجھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنی کتاب کے لیے مواد تو جمع کر لیا لیکن ان کو کتاب کی ترتیب و تنقیح کی فرصت نہیں ملی۔ اور اسی صورت میں کتاب کی روایت شروع ہوگئی۔ اگر ان کو نظرِ ثانی کی مہلت مل جاتی تو ممکن ہے وہ ناتمام ابواب کو نکال دیتے یا ابواب کو نقل کردہ روایات کے مطابق کر دیتے یا بعض مکررات کو نکال دیتے۔

ترتیب کے لحاظ سے صحیح مسلم صحیح بخاری سے زیادہ سائنٹفک ہے۔ امام مسلمؒ نے ہر حدیث کے لیے ایک خاص مقام، جو معنی و مفہوم اور حکمت دین کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھا، مقرر کیا اور وہیں اس روایت کے تمام طریقوں کو جمع کر دیا۔ اس وجہ سے صحیح مسلم سے استفادہ بہت آسان ہے۔ امام بخاریؒ کسی حدیث کے مختلف طرق کو متفرق و متباعد ابواب میں ذکر کرتے ہیں جس سے حدیث کے طالب علم کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

اصحابِ بدعت اور شیعہ رواۃ سے روایت لینے میں امام مسلمؒ اگرچہ زیادہ متہم ہیں لیکن امام بخاریؒ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مثال کے طور پر حدیث کے شیخ محمد بن شہاب زہری نہ صرف شیعہ ہیں بلکہ ان تمام روایات کے واحد راوی ہیں جن پر شیعہ مذہب کا دارومدار ہے۔ امام صاحب کے نزدیک وہ ثقہ ہیں اور ان پر ان کا اعتماد اسی نوعیت کا ہے جس طرح کا اعتماد امام مالکؒ نے مؤطا میں کیا ہے۔ حالانکہ شارحین برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ زہری بات کا بتنگڑ بنانے اور مختلف روایات میں گھپلا کر کے ان کے مزاج کو بدلنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ انہوں نے متعدد روایات ایسی بیان کی ہیں جن کے بیان میں وہ منفرد ہیں اور ان سے خاص صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کی اہانت مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام شیعی ذہن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ اگر امام صاحب نے ان کی روایت قبول کرتے وقت درایت کے اصولوں سے کام لیا ہوتا تو دورِ صحابہؓ کے بارے میں بہت سی وہ غلط فہمیاں نہ پیدا ہوتیں جو زہری کی ان روایات نے پیدا کر دی ہیں جن کو صحیح بخاری میں جگہ مل گئی ہے۔ یہاں ہم نے زہری کی ایک مثال پیش کی ہے۔ آگے روایات کی شرح کرتے وقت ہم دکھائیں گے کہ شیعہ رواۃ کی ریشہ دوانیوں نے بات کو غلط رُخ دینے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

(ترتیب : سعید احمد)

افاداتِ فراہی

خالد مسعود

حکمتِ قرآن

اللہ تعالیٰ کی معرفت :-

یاد رہے کہ ایمان باللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تین صفات کمال ۔ رحمت ، قدرت اور حکمت ۔ پر ایمان لانا ہے۔ ان تینوں صفات کے دائرہ میں دوسری تمام صفاتِ جلال وصفاتِ جمال داخل ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا قدیم ہونا ، اس کا ہمیشہ باقی رہنا ، اس کا زندہ جاوید ہونا ، اس کا علم ، سخاوت ، خلاق ، بادشاہی ، بے نیازی ، عزت ، حلم ، تدبیر ، اس کا ہدایت دینا ، دعا سننا ، خلق پر نظرِ عنایت کرنا ، فضل کرنا ، معاف کرنا ، مظلوم کا انتقام لینا ، حق و عدل کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس کے علاوہ وہ تمام صفات جن کی طرف اسمائے حسنیٰ رہنمائی کرتے ہیں ۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان تین صفاتِ کمال پر ایمان لے آتا ہے اس کو ایمان باللہ کے باقی ارکان کی ہدایت بھی حاصل ہو جاتی ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ	اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے ۔
(تغابن ۱۱)	

اس مضمون کو دیگر کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے ۔

جو شخص رب کو ان کامل صفات کے ذریعے پہچان لیتا ہے تو اس کے اندر لازمی طور پر شکر اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو خدا کی نعمتوں میں گھرا ہوا پاتا ہے ۔ اگر وہ خدا کا شکر ادا نہ کرے تو یہ اس کی اکڑ اور حق تلفی کی دلیل ہے اور اگر خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے تو ایسا شخص شکر کا حق ادا نہیں کرتا ۔ مزید برآں یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس شخص کے اندر فطرتِ انسانی کے احساسات کا شعور کامل نہیں ۔ فطرتِ انسانی جلال و جمال کو محبوب رکھتی ہے ۔ اگر فطرت کا یہ پہلو معدوم ہو جائے تو انسان چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے ۔ انسان پر یہ اثر اس کی فطرت کے اخلاقی پہلو کے لحاظ سے ہوتا ہے باقی رہا

اس کا علمی پہلو تو ہم مختصر طور پر اس کو بھی واضح کرتے ہیں ۔

رب تعالیٰ کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ پہچاننے کی کوشش کرنا ۔ انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے ۔ جس طرح حقائق کے ادراک کے نتیجہ میں طبیعت کے اندر تمام معارف ابھر آتے ہیں ۔ اسی طرح کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے نتیجہ میں انسان رب کو پہچاننے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ یہاں اس مسئلہ کو ثابت کرنے کا موقع نہیں ، بلکہ مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ قرآنِ مجید کے نصوص کی رو سے دین کا نظام کیا ہے ۔ اس بارے میں قرآن نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ رب تعالیٰ پر ایمان انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے ۔ آگے ایسے مباحث آئیں گے جو اس مسئلہ کو واضح کر دیں گے ۔ یہاں میں ایک معترض کی طرح خود ہی یہ سوال کرتا ہوں کہ میں نے خلق کی جانب سے صرف شکر ہی کو کیوں واحد جذبہ قرار دے لیا ہے ۔ حالانکہ انسان کے نفس میں دوسرے بھی کئی جذبے ہیں مثلاً ایک عظیم اور قاہر رب کے لیے اس کے اندر خوف اور ایک صانع اور ماہر رب کے لیے حیرت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے چنانچہ عام مذہبی گروہوں کے مذہب کی بنیاد خوف پر اور اکثر فلاسفہ کے مذہب کا مدار حیرت و استعجاب پر ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ باری تعالیٰ کے مظاہر میں انہی دو قسموں کے مظاہر کی کثرت ہے اور یہ انسان سے قریب تر اور اس کے لیے واضح تر بھی ہیں ۔ اسی لیے انسان معمولی غور و فکر کے بعد ان پر متنبہ ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ؕ	اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے کہ ان کو عزیز و علیم ذات نے پیدا کیا ہے ۔
(الزخرف ۹)	

ظاہر ہے کہ رب کی اس پہچان کا سبب یہی ہے کہ کائنات میں اس کی عظمت اور صناعی کے نشان نہایت واضح ہیں ۔

باری تعالیٰ کی پہچان کے لیے صرف اس کی صفاتِ قدرت و صنعت پر انحصار کیا جائے تو یہ شرک کی نفی تو کر دیتی اور مزید غور و فکر پر ابھارتی ہیں ۔ لیکن آدمی جب تک صفاتِ رحمت و حکمت کا ادراک نہیں کرتا وہ دین تک نہیں پہنچ پاتا ۔ کیونکہ یہ وہ صفات ہیں جو غایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور صفاتِ حکمت و قدرت انہی کی خاطر ہیں ۔ جب آدمی کا غور و فکر

اس کو یہاں تک لے آتا ہے تو وہ ربوبیت کی معرفت حاصل کر لیتا اور یہ جان لیتا ہے کہ باری تعالیٰ ہی رحمان ورحیم ہستی ہے۔ اس وقت اس کو رب کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا شکر ادا کرتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے۔ اس حقیقت پر قرآن سے کئی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی صفات پر ایمان اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آخرت پر بھی ایمان لایا جائے اور کتاب الٰہی کی آواز کانوں میں پڑے تو اس پر بھی ایمان لایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کے اندر خدا کے پیغام کے لیے پیاس موجود ہے۔ وہ اس کی ملاقات کا مشتاق ہے، اس کے ذکر سے وہ سکون پاتا ہے، وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور اس کے ہاں سے کوئی خبر لائے۔ یہ تمام کام اس جذبہ ہی کے مظاہر ہیں جو شکر سے پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کے ثمرات :-

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پہلا کام رب تعالیٰ کی ان نشانیوں پر غور کرنا ہے جنہوں نے آفاق و انفس کو بھر رکھا ہے اور جو صفاتِ جلال وجمال کے کامل ہونے کی دلیل ہیں۔ دوسرا کام جو پہلے ہی کا نتیجہ ہے وہ خدا کے لیے شکر و محبت کے جذبات کا پیدا کرنا ہے۔ اسی سے بندہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا، اس کے آگے عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا اور اس سے امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہی ایمان کے ثمرات ہیں۔ اس سے نفس کی آلودگی دور ہوتی ہے اور بندہ تزکیہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ دل کی بعض مشغولیتیں شکر و محبت کا جذبہ پیدا ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان کے سبب سے بندہ نادر صورتوں کے سوا کسی ایسے شخص کا محتاج ہوتا ہے جو اس کو خبردار کرے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد، قوم اور قبیلہ کے زیر اثر نشوونما اور تربیت پاتا ہے۔ وہ ان سے جو کچھ سنتا ہے وہی بات اس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اس فوری جذبہ کی خواہشات اور ذاتی مشغولیت کے زیر اثر وہ عام طور پر خیالات اور اخلاق میں انہی کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ بہت نادر ہوتے ہیں جو اللہ کی آیات میں غور و فکر کرنے پر از خود متنبہ ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء اور حنیف لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے متنبہ ہونے کے بعد جن لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں وہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت مغلوب نہیں ہوئی ہوتی۔ وہ حق کی طرف بلانے والے کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ جو کبھی تو فوراً ہوتا ہے

اور کبھی اس میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس کا انحصار آدمی کے غور کرنے کی استعداد اور اس کے حسنِ اخلاق پر ہوتا ہے۔ انسان کو فطرت میں جو بھی صلاحیتیں حاصل ہیں۔ ان میں ہم اسی چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی کے باعث وہ فنون کا عالم اور ماہر بنتا اور حسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی میں استعداد نہ ہو تو وہ سیکھ ہی نہیں سکتا۔ گویا پہلی تعلیم سن کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور و فکر سے آتی ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ میں اس ہدایت کے قبول کرنے سے آتی ہے۔ جس پر انسان کی فطرت پیدا کی گئی ہے۔ ادراک کی قوت ہو یا قوتِ ارادی دونوں کی فطرت حقیقت میں حق اور خیر ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ تمام قوتیں جس طرح استعمال کی جا سکتی ہیں اور اس سے وہ اصلاح پاتی اور ترقی کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ بے کار چھوڑی جا سکتی ہیں، ان کو بگاڑا جا سکتا ہے اور یہ فنا بھی ہو سکتی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ دین اسلام انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اب آئیے اس دین کے نظام کو سمجھیں۔

دین کے نظام کی بنیادیں :-

دین کے نظام کی اولین بنیاد عدل ہے۔ یہ عقل اور اخلاق کا نقطہ امتزاج ہے۔ حسنِ اخلاق کا مطمعِ نظر احسان ہے۔ اسی کا ایک پہلو ان حقوق کا ادا کرنا ہے جو کسی شخص پر واجب ہوں۔ یہی شکر ہے۔ لہٰذا شکر عدل میں داخل ہے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے کہ اس کے رب کے جو احسان اس پر ہیں ان کا حق اس پر واجب ہے تو اس شخص کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ شکر کی ادائیگی کو واجب قرار دینا عدل کا تقاضا ہے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ آپ تمام نعمتیں تو بلا معاوضہ حاصل کریں اور ان کے جس حق کی ذمہ داری آپ پر ہے اس کو ادا نہ کرنا چاہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (النحل ۹۰)

بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور ذوی القربیٰ کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔

یہ آیت اس حقیقت کی شاہد ہے کہ نظام کی اولین بنیاد عدل ہے۔ اس کے تحت شکر کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اگر عقل کی جانب سے ہو تو اس کی بصیرت اور اگر نعب کی جانب سے ہو تو اس کی حیرت کی دلیل ہے۔ نعمت کا انکار کرنے والا دھوکہ میں مبتلا، حق تلفی کرنے والا، کم ظرف، کمینہ، کم فہم اور بے حیا ہوتا ہے۔ وہ ایک فیاض کے دستر خوان سے کھاتا ہے۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنی احتیاج میں اس نے کہاں سے کھانے کو پایا۔ اس کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ منعم کے احسان کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ایسا شخص حماقت اور بے شرمی دونوں عیوب کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔

ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

يَاكُلُوْنَ كَمَا تَاكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد ۱۲)

"وہ کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ اور دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔"

ایسے لوگ حرص اور پیٹ کے غلام ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ادراک کے لحاظ سے بندے کا اولین کام اپنے منعم کو پہچاننا اور عمل کے لحاظ سے اس کا پہلا کام شکر ادا کرنا ہے۔ جب وہ شکر کا حق ادا کر لیتا ہے تو اپنے عمل سے عدل کی شہادت دینے والا بن جاتا ہے۔ اگر وہ شکر ادا نہیں کرتا تو وہ ظلم ڈھانے والا اور عدل کا مخالف بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بکثرت مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بندہ اپنی شکر گزاری سے اگر نفع پہنچاتا یا ناشکری کر کے اگر نقصان کرتا ہے تو اپنی ذات ہی کا کرتا ہے۔ اس کا رب ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔

شکر کی حقیقت :-

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شکر اصل ایمان اور اولین عبادت ہے اور یہ اللہ کے خالق اور منعم ہونے کا تقاضا ہے۔ ہم شکر کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

جس طرح عدل اپنی ذات کے اعتبار سے ایک لازمی صفت ہے۔ اسی طرح شکر بھی ایک لازمی صفت ہے۔ یہ عدل ہی کا ایک جزو اور اسی کا اظہار ہے۔ اس لیے بالبداہت ضروری ہے۔ شکر کا مفہوم امکان کی حد تک اور اگر کوتاہی ہو تو اس کے اعتراف کے ساتھ احسان کا بدلہ چکانا ہے۔ جس پر انعام ہوا ہو وہ کوتاہی کے الزام سے تو کبھی بچ نہیں سکتا۔

کیونکہ جس نے انعام کیا اس کو پہل کرنے کی فضیلت تو حاصل ہو ہی گئی۔ جب معاملہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہو تو کوتاہی کے پہلو لاتعداد ہوتے ہیں۔ شکر، جیسا کہ معلوم ہے، احسان کے مساوی بدلہ کا نام ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر جو انعام فرمایا ہے وہ کسی ذاتی ضرورت کے تحت نہیں فرمایا ہے بلکہ محض رحمت و شفقت کے سبب سے فرمایا ہے اور خداوند تعالیٰ کے انعامات اس کی رحمت کے نشان ہیں۔ اس لیے اس رحمت و شفقت کے مشابہ اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ ایک ایسی کامل محبت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی جو ہمارے امکان کی حد تک اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو۔ اس کے علاوہ اللہ کی ذات کو اپنی مخلوق پر جو فضیلت حاصل ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں لہٰذا جو شخص اپنی انتہائی وسعت کے مطابق اللہ سے محبت نہیں کرتا وہ خُدا کا شکر ادا کرنے والا نہیں ہے اسی لیے تورات، انجیل اور قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ سے کامل محبت رکھنا لازم ہے۔ یہ چیز محبت کی وحدت کا تقاضا بھی کرتی ہے جیسا کہ تورات اور انجیل میں واضح کیا گیا ہے اور قرآن نے تو نہایت کامل طریقہ سے اس مضمون کو کھولا ہے۔

چونکہ احسان کا بدلہ احسان ہونا عدل ہی کا تقاضا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہمسر مان کر شرک کا ارتکاب ایک ظلم عظیم ٹھہرا، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے۔ نیز چونکہ شرک میں ایک قابلِ احترام نفس کو اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکا کر ذلیل کیا جاتا ہے اس لیے شرک کو رجس (ناپاک) قرار دیا گیا۔ اسی سبب سے تورات میں بتوں کو رجس کہا گیا ہے اور شرک کو چھنالے سے تشبیہ دی گئی ہے تاکہ یہود پر نفس کی توہین کا پہلو بھی واضح ہو اور خدا کو اس سے جو نفرت ہے اس کو وہ بیوی کے لیے شوہر کی غیرت کے حوالہ سے سمجھ سکیں۔

کسی کے بارے میں اگر یہ علم ہو جائے کہ وہ آپ سے محبت رکھتا ہے، اس نے آپ کو برگزیدہ کر لیا ہے اور اپنی کسی غرض کے بغیر آپ پر انعام کر رہا ہے تو یہ چیز آپ کے اندر اس کے لیے محبت پیدا کر دے گی۔ پھر جس قدر آپ اس کی نعمتوں کو یاد کریں گے اسی قدر اس کے لیے آپ کی محبت میں اضافہ ہو گا۔ لہٰذا پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ آپ اس حقیقت کو پہچانیں کہ اللہ تعالیٰ رحمان، رحیم، پالنے والا، مہربان، محبت کرنے والا، قدردان، بے نیاز، ستودہ صفات، درگزر فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد۔ شعوری طور پر پاکیزہ

فطرت کے ساتھ ہم اس کا شکر کرنے والے بنیں تو یہی حکمت کی راہ کا پہلا قدم ہے ۔ جیسا کہ ارشاد ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ

(لقمان - ۱۲)

" اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا وہ اپنے ہی لیے رہے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے ۔"

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اس کی صفت کے ساتھ پہچان لیا اور اس پر ایمان لایا، لازم ہے کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا شدید جذبہ بھی پیدا ہو ۔ اسی لیئے قرآن مجید میں فرمایا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

(بقرہ ۱۶۵)

جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں ۔

جب کسی سے محبت ہو جائے تو آدمی اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے ۔ محبت میں لذت اور کشش ہوتی ہے ۔ لہذا جب ایک آدمی کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف کشش محسوس کرتا اور اس میں محو ہوتا ہے ۔ اس کو اس کی یاد سے آرام ملتا ہے ۔ وہ اس کی نشانیوں سے مانوس ہوتا ہے ۔ وہ اس شخص کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کو محبوب کی یاد دلائے اور اس کے قریب ہونے کی راہیں بتائے ۔ وہ اس چیز سے جان چھڑاتا ہے جو محبوب سے اوجھل کرنے کا باعث بن رہی ہو اور اس شخص کے طریقے کی پیروی کرتا ہے ۔ جو اس سے قرب پانے میں کامیاب ہو چکا ہو ۔ اسی لیے فرمایا ۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(آل عمران ۳۱)

کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۔

کتنا عظیم الشان ہے یہ وعدہ ! اس سے بلند تر مرتبہ کونسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنا محبوب بنالے اور ان کے گناہوں کو معاف فرما دے ۔ جو شخص اس مرتبہ کو پانے کا خواہشمند ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے غفور و رحیم ہے ۔ بلکہ وہ تو ان لوگوں پر زیادہ شفقت

فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کر لیتے ہیں ۔ اس حقیقت کو نہ صرف قرآن نے بلکہ انجیل نے بھی واضح کیا ہے ۔

عدل کی اہمیت :-

اوپر کی بحث سے دین میں عدل کا یہ مقام واضح ہوا کہ توحید اور عدل دونوں کی اصل ایک ہے اگر توحید اسلام کا سرا ہے تو عدل (اور اس کے ساتھ شکر) اس کی اساس ہے ۔ دیکھیئے یہ حقیقت قرآن مجید کی آیت سے کس طرح روشن ہو رہی ہے ۔ فرمایا ۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(آل عمران ۱۸)

اللہ، فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب اور حکمت والا ہے ۔

ہم جس طرح اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت میں منفرد ہے اسی طرح ہمارا ایمان اس پر بھی ہے کہ وہ عدل کے مطابق کام کرتا ہے لہذا اس کے احکام اور افعال میں ظلم یا بے انصافی کا شائبہ تک نہیں ہے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ الوہیت کی عزت اور تقدس کے اس کے سوا کوئی معنی ہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ عادل اور قسط کو پسند کرنے والا ہے ۔ یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ الوہیت کے مفہوم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ اس نے اپنے اندر رحمت کو سمو رکھا ہے ۔ پس رب کا قرب حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ مذکورہ دو صفتوں یعنی عدل اور احسان کو اختیار کر کے اپنے مولیٰ کے ساتھ موافقت پیدا کی جائے شکر ان دونوں صفات کا جامع ہے ۔ ہماری نماز اللہ کا شکر اور عدل ہے ۔ اسی طرح ہماری زکوٰۃ بھی اس کا شکر اور عدل ہے اور یہ اس کے انعام کا شکر ہے ۔

شکر کا تقاضا —— ہدایت کی طلب :-

ہمارے اس بیان سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ پہلا کام جس سے عدل کا ثبوت ملتا ہے شکر ہے ۔ جب بندے کے اندر شکر پیدا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں ۔ وہ

ملکوت الٰہی کا مشاہدہ اور اس پر غور کرتا ہے ۔ وہ اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ اس کا ایک ہی رب ہے جس کے اندر جمال و جلال کی صفتیں پورے کمال کے ساتھ جمع ہیں ۔ یہ چیز اس کے اندر محبت ، سکینت ، مرعوبیت اور نیازمندی پیدا کرتی ہے ۔ اس سے اس کا وہ عقدہ حل ہوتا ہے جو اس کے دل میں کسی بُرے کام پر ضمیر کی ملامت کی صورت میں پیدا ہوتا تھا ۔ وہ اس ملامت کو محسوس کرتا اور اس کے نقطۂ آغاز کی جستجو کرتا ہے ۔ ربِ رحیم کے لیے اس کی عاجزی سے ضمیر کے اندر اس احساسِ ذمہ داری کے نقطۂ آغاز کا اس کو سراغ مل جاتا ہے ۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر حیا ، خوف ، امید ، رضائے الٰہی اور تمام ایسے اخلاق اپنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کو رب کا قرب عطا کر دیں ۔ اس طرح وہ ایک مومن ، مسلم اور موحد بن جاتا ہے ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کو تنبہ اس کی فطرت کی جانب سے ہوا یا دل کی روشنی سے ہوا یا وحی الٰہی سننے سے ہوا ۔ یا اس کو بصیرت اور یقین سے متمتع کرنے کا باعث کوئی ایسا شخص بنا جس نے ان چیزوں کی طرف اس کو دعوت دی ۔

یہ ایمان جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے ایمان کی ابجد اور اس کا ایک مجمل خاکہ ہے ۔ اس میں روزِ جزا اور رب کی رحمت و عفو پر ایمان شامل ہے ، خدا کی محبت اور اس کی رضا طلبی اس کی ایک شاخ ہے ، جلیل و برتر آقا سے ڈرنا اس کا ایک جزو ہے ، اس میں ایسے اچھے اعمال کا عزم از خود شامل ہے جن کا ربِ قدوس کی نگاہوں میں خوبصورت اور پسندیدہ ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہو ۔ اس کے بعد جب بندہ کسی ایسے شخص کی بات سنتا ہے جو اس ایمان کی تفصیلات سے اس کو آگاہ کرے تو اس کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اس کی پیروی پر کمر کس لیتا ہے ۔ اس وقت اس کی حالت یوں ہوتی ہے جیسے وہ اپنی متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں تھا اور اس نے اس کو پا لیا ۔ یا جیسے وہ راہ گم کردہ تھا ، رستے کی تلاش میں سرگرداں تھا ۔ اور کسی پکارنے والے نے اس کو راستہ بتا دیا ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری لے رکھی ہے کہ وہ بنی آدم کی طرف ہادی اور داعی انہی کے اندر سے بھیجتا رہے گا ۔ اس نے بندوں سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان کی ہدایت کو قبول کریں ۔ یہ حکم اس نے اس وقت دیا جب انسان کو زمین پر سکونت کے لیے بھیجا جیسا کہ فرمایا ہے ۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا
فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى

ہم نے کہا اترو یہاں سے سب ، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
(البقرہ ۳۸ - ۳۹)

کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو ، وہی لوگ دوزخ والے ہیں ۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

جو لوگ داعی کی پکار سنتے ہیں ، ان میں سے بعض تو تیزی سے اس کی طرف لپکتے ہیں بعض اتنا عرصہ رکے رہتے ہیں جس عرصہ میں وہ جہالت کے اندھیاروں اور خواہشِ نفس کی گمراہیوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب وہ اپنی عقل کے بندھنوں کو کاٹنے اور دل کے قفلوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو شک کی تاریکیوں میں پڑے رہتے ہیں ۔ اس کا سبب وہ فساد ہوتا ہے جو حسد ، کبر ، نفرت جیسے بُرے اخلاق کی قسم کا ان کے دل پر غلبہ پالیتا ہے ۔ وہ یا تو بالکل اندھے بنے رہتے ہیں ۔ یا ان کو حق کا یقین تو حاصل ہو جاتا ہے تاہم وہ انکار ہی کی روش اختیار کرتے ہیں ۔ قرآن مجید نے ان تین قسم کے انسانوں کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے ۔ ان میں سے ایک موقع یوں ہے ۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ
لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ
يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَ
قُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ۔ رَبَّنَا إِنَّكَ

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہل عقل کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں ۔ ان کے لئے جو کھڑے ، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں ۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار ، تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے ۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے ۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب

مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۔ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَکَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (آل عمران: ۱۹۰ - ۱۹۳)

سے بچا۔ اے ہمارے رب، جس کو تونے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔

آیت میں " ربنا ماخلقت ھذا باطلا... سے ان کے نتیجۂ فکر کو بیان کیا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی نشانیوں پر غور کرتے ہوئے ان میں اللہ کی قدرت وعظمت کے آثار دیکھتے ہیں۔ ان میں ان کو کاریگری اور ایک مضبوط نظام کی شانیں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے لیے رحمت اور عنایت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ان کو خدا کی حکمت کا یقین ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی ذات کی طرف اپنی نگاہ لوٹاتے ہیں تو ان کو یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ جب عزیز و حکیم رب نے کسی بھی چیز کو بے مقصد پیدا نہیں کیا تو یہ بات بھی شک سے بالا ہے کہ اس نے انسان کو بھی کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات اس پر واجب ہے کہ وہ وہی کام کرے جو خدا نے اس سے چاہے ہیں۔ اسے اس کی رضا کا طالب ہونا چاہیے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس پر خدا کا غصہ بھڑکے گا۔ جب بندہ غور کرتا ہوا یہاں تک پہنچتا ہے تو اس کی زبان سے وہ دُعا نکلتی ہے جو سبحانک فقنا عذاب النار سے آگے وتوفنا مع الابرار تک ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اہل عقل قرار دیا ہے۔

یہی لوگ ہیں کہ جب وہ کسی منادی کو ایمان کی طرف بلاتے ہوئے سنتے ہیں تو اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ان کو ان کے رب غفور کی راہ اور نیکوں کی رفاقت کی دعوت دے رہا ہے۔ ان کا یہ نتیجہ اخذ کر لینا ہی ان کے عقلمند ہونے کی روشن دلیل ہے۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے :-

قرآن اور سنت دونوں نے اس بات کی تصریح کر دی ہے اور عقل پر بھی یہ بات واضح ہے کہ عمل کرنے والے کے لیے عمل اگرچہ فی نفسہ مفید یا مضر دونوں ہو سکتا ہے لیکن عمل کرنے والے کو وہ اس کی نیت کے مطابق ہی فائدہ پہنچاتا ہے۔ آدمی کے حسنِ نیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل رب کی رضا کے لیے ہو۔ دکھاوے اور شہرت کے لیے نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کا مقصد لوگوں سے کوئی نفع کمانا ہو۔ یہ حسنِ نیت کا مختصر اور عام مفہوم ہے۔ اسی کو اخلاص اور اسلام کا نام دیا گیا ہے۔ ایک مخلص موحد اپنے رب کی رضا کا طالب اور اس کے غضب سے ترساں رہتا ہے۔ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرتا اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتا اور اس کے رسول کی اتباع کرتا ہے۔ چونکہ اللہ کی محبت آیت الذین امنو اشد حبا للہ (اہل ایمان کی محبت اللہ کے لیے سب سے زیادہ ہوتی ہے) کی رو سے ایمان کا مغز ہے اس لیے رسول کی اتباع کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران ۳۱)

" کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔"

جب بندہ محبتِ الٰہی میں کمال حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو الہام کے ذریعے ہدایت فرماتا ہے یا کسی کو مقرر کر دیتا ہے کہ اس کے عمل کی درستی کی اس کو ہدایت دے۔

[illegible] فرمایا۔

وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹)

اور جو ہماری راہ میں مشقتیں جھیلیں گے تو ہم ان کو اپنی راہوں کی ہدایت دیں گے۔

مخلص موحد لوگوں کا حال یہی ہے اور اس راہ کو اختیار کر کے اللہ کے بے شمار بندوں [illegible] کیا ہے۔

[illegible] اہل علم تو اپنے ہر عمل سے وہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اللہ نے اس میں [illegible] کتاب و سنت میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کو معرفت حاصل ہے

وہ جب ایک عمل میں یہ نفع نہیں دیکھتے تو جان جاتے ہیں کہ عمل صحیح نہیں ہوا۔ پھر وہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس عمل کے آداب و شرائط میں سے کون سی چیز پوری نہیں ہوئی۔ وہ کوتاہی کو دور کر کے اپنے عمل کو درست کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے بندوں میں سے حکیم لوگ ہیں۔ ان لوگوں کو یہ درجہ کتاب اللہ میں غور و فکر، خدا خوفی کے احساس اور بھلے اور پائیدار کاموں کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ کام رب کی خوشنودی اور اس کی عبودیت میں اخلاص کے کام ہیں۔ یہی راہ حسنِ نیت کی راہ ہے۔ اس حد تک یہ حکما ان مخلصین کے عمل میں شریک ہیں۔ جنہوں نے اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص کر دی۔

بقیہ: اسالیبِ قرآن (فضلی)

ایک ذہین آدمی سیاق و سباق کی روشنی میں اس مناسبت کو سمجھ جاتا ہے۔ یہ موقع بھی معنوی فصل کا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

سورہ آل عمران میں غزوہ اُحد پر تبصرہ کے دوران یک لخت سود کی ممانعت کا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ آیت ۱۳۰ میں فرمایا ہے کہ مسلمانو! بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اسی ضمن میں چند باتیں کرنے کے بعد پھر وہی جنگِ اُحد پر تبصرہ شروع کر دیا ہے۔ اب کہاں غزوہ میں مسلمانوں کی کارکردگی اور کہاں سود در سود کا مضمون۔ بظاہر دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس مقام پر جنگ کے مقاصد کے لیے مسلمانوں میں جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ پیدا کرنے پر زور دینا چاہتا ہے اور مثبت طور پر اس کی ہدایت دینے کے بجائے منفی طور پر بات کو یوں شروع کیا ہے کہ حُبِ مال دل سے نکالو۔ سود کے مرض سے بچو اور انفاق کی طرف آؤ۔ گویا سیاق و سباق اصل بات کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے بالکل کافی ہے لیکن غزوہ اور سود کی مناسبت ذرا سے تدبر کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔

مقالات

خالد مسعود

رسولِ اکرمؐ کی دعوت کی خصوصیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید نے رسول، نبی، مبشر، نذیر، معلم اور مزکی کی صفات سے روشناس کرایا ہے۔ ان میں سے ہر صفت آپ کی متعدد خصوصیات میں سے کسی ایک خصوصیت کو واضح کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک صفت آپ کے لئے داعیاً الی اللہ باذنہٖ کی استعمال ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہیں اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والے، لوگوں کو خدا کی راہ کی طرف پکارنے والے۔ بعثت کے بعد آپ کی پوری زندگی اسی دعوت سے عبارت ہے۔ آپ کے شب و روز لوگوں کو اللہ کی راہ کی طرف بلانے میں گزرے۔ آپ نے ہر وہ ممکن طریقہ اختیار فرمایا جس سے ان تک آپ اللہ کا پیغام پہنچا سکتے تھے۔ ابتدا میں آپ صرف اپنے گھر والوں اور قریبی دوستوں کو اللہ کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انذار عشیرہ کے خطاب کا مسئلہ آپ کو متفکر کر دیتا ہے اور آپ چادر اوڑھ کر اس مشکل مرحلہ میں دعوت کے نہج پر غور کرتے ہیں۔ آپ اہل خاندان کو کھانے کی دعوت پر بلاتے اور ان کو خدا کا پیغام سناتے ہیں جس سے خاندان کے لیڈر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ مکہ کی آبادی کو متوجہ کرنے کے لیے آپ کوہِ صفا پر چڑھ کر واصباحاہ کا نعرہ لگا دیتے ہیں جس کو سن کر تمام اہل مکہ آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور آپ فرداً فرداً ہر قبیلہ کو مخاطب کر کے پیغامِ ہدایت دیتے ہیں۔ آپ باہر سے مکہ آنے والوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور ان کو اپنی دعوت سے روشناس کر کے قبائل تک اپنی آواز پہنچاتے ہیں۔ حج کے موقع پر آپ منیٰ میں قبائل کے خیموں میں جا جا کر اسلام کی دعوت کا چرچا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قبائل کے سرداروں کو دعوت کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے آپ کا پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کا شوقِ فراواں آپ کو طائف لے جاتا ہے۔ جہاں آپ کفار کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ ہجرت کے بعد نئے حالات میں دعوت کا نہج بدل جاتا ہے۔ لیکن

مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہاں آپ عرب قبائل کے ساتھ معاہدات کرتے اور ان کے اندر مبلغ بھیجتے ہیں۔ ملک کے اندر حالات روبہ اصلاح ہو جاتے ہیں تو گردوپیش کی مملکتوں کے فرمانرداؤں کو مکاتیب لکھ کر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اور ان کی قوم کی صلاح و فلاح اس پیغام کو قبول کرنے میں ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں۔ آپ کی دعوت اتنی موثر ہے کہ عرب کا ہر سلیم العقل انسان اس کو قبول کر لیتا ہے اور پڑوسی ممالک بھی اس کے اثرات کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انسان تو انسان، جنوں کی جماعت کے کان میں بھی اگر آپ کی دعوت پڑتی ہے تو وہ بھی اس کو قبول کر کے اپنی قوم میں اس کا پرچار کرتے ہیں کہ

يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ	"اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ۔"
(الاحقاف ۳۱)	

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی خصوصیات

یہ دعوت الی اللہ جس نے تیئیس برس حضور ؐ کو گراں بار رکھا، تقاضا کرتی ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس کی خصوصیات کیا تھیں۔

دعوت کا نقطۂ جامعہ ـــــ توحید:

قرآن مجید اور سیرت النبی ؐ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت جس نقطہ پر مرکوز رہی وہ توحید ہے۔ یعنی اپنے اور ساری کائنات کے مالک و آقا، مدبر و متصرف کے طور پر صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کا اقرار اور اس اقرار کے نتیجہ میں عبودیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت۔ اس دعوت کو آپ نے گوناگوں پہلوؤں سے واضح کیا۔ اس کے نہایت دل نشین دلائل فراہم کیے۔ یہ واضح فرمایا کہ توحید کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ہر زمانے کے انبیاء و رسل اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کاوش کرتے رہے ہیں۔ کلمۂ توحید اور اس پر مبنی عقائد و نظریات کی تمثیل یوں ہے جیسے ایک ثمر آور و سایہ دار درخت جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی اور شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہوں اور وہ زمین اور فضا دونوں سے غذا اور قوت حاصل کر کے نہایت نفع بخش اور بابرکت بن گیا ہو۔ اس کے برعکس

کلمۂ شرک اور اس پر مبنی عقائد و نظریات کی تمثیل خودرو اور خاردار، بے ثمر اور بے فیض جھاڑیوں کی ہے جن کی کوئی مضبوط جڑ ہوتی ہے نہ فضا میں ان کا کوئی پھیلاؤ ہوتا ہے۔

ان تمثیلات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے، نہ خدا کے اتارے ہوئے کسی دین میں۔ جب کہ کلمہ توحید کی جڑیں انسانی عقل و فطرت کے اندر بھی گہری اتری ہوئی ہیں اور عند اللہ بھی یہی اصل قدر و قیمت رکھنے والی حقیقت ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید کی برکات ابدی اور دائمی ہیں، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اس کی نورانیت سے جو دل منور ہو وہ ہمیشہ آسودہ اور شاد کام رہتا ہے۔

توحید کی یہ تعلیم حقیقی معنوں میں زندگی بخش تعلیم ہے۔ اس نے کمزوروں کو وہ قوت عطا کی کہ جباروں کا جبر اور ستم گروں کا ستم ان کو اپنے موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کے سینوں پر بھاری پتھر رکھے گئے اور ان کے جسموں کو داغا گیا لیکن پھر بھی ان کی زبان احد احد کا نعرہ الاپتی رہی۔ یہ تعلیم انسان کو وہ رفعت عطا کرتی ہے جس کے سبب سے وہ ہر آستانے کی جبہہ سائی کے بجائے ایک ذات سے وابستہ ہو کر رہتا ہے۔ اس طرح وہ ایک حقیقی الٰہ کو راضی کر کے بہت سے جھوٹے خداؤں کے آگے عاجزی اور فروتنی کی ذلت اٹھانے سے بچ جاتا ہے۔ جو لوگ آنحضرت ؐ کی اس تعلیم سے آشنا ہوئے ان کو قیصر و کسریٰ کے درباروں کی چکا چوند مرعوب نہ کر سکی اور وہ ان کی شوکت و حشمت کو پامال کرتے ہوئے ان کی رعایا کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

عقیدۂ توحید ہی کا ایک لازمی تقاضا آخرت کی ابدی زندگی کا تصور اور اس میں جزا و سزا کا عقیدہ ہے۔ دنیا کی زندگی ایک محدود مدت کے لیے ہے۔ اس مدت کے دوران میں انسان خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے متمتع ہوتا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے مالک کا وفادار بندہ ہے یا نہیں۔ اس کے عمل کا نتیجہ اس وقت سامنے آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کی بساط لپیٹ کر ایک نیا عالم وجود میں لائے گا۔ جس میں حساب و کتاب کے بعد ایک شخص کے لیے یا تو ابدی راحت کا پروانہ ہوگا، یا اُسے ابدی سزا سنائی جائیگی۔

آخرت کے اس تصور کے ساتھ آدمی یہ رائے رکھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کی ایک ایک حرکت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل قابلِ محاسبہ ہے جس کو میزان میں تولا جائے گا۔ دنیا کے اعزہ و اقربا اور دوست و مونس آخرت میں اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے اور اس کا عمل ہی اسے بچائے گا یا عذاب سے دوچار کرے گا۔ اس تصور کے نتیجہ میں انسان

دنیا میں ذمہ دارانہ رویہ اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ جب دنیا کی جد وجہد کے لیے نکلتا ہے تو ایک طرف اپنی زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے اور دوسری طرف خیر اور شر میں امتیاز کرتا ہوا زندگی گزارتا ہے۔ اس تصورِ آخرت کے گہرے شعور کے نتیجہ میں اخلاص وفا شعاری، نیکی، دیانتداری، صدق، امانت وغیرہ جیسی زندگی بخش اقدار معاشرے میں پھیلتی ہیں جن سے دنیا رہنے کے لیے ایک حسین مقام بن جاتی ہے۔ یہ معاشرہ ایک بیدار معاشرہ ہوتا ہے۔ جس میں ہر طرف باہم اعتماد، محبت اور تعاون و تناصر کی فضا ہوتی ہے۔

دعوت کی بنیاد فطرتِ انسانی پر ہے :-

آنحضرتؐ کی دعوت فطرتِ انسانی کی اساس پر قائم ہے۔ یہ کہیں باہر سے مسلط نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے یہ انسانی قویٰ اور صلاحیتوں کو مفلوج کرتی ہے اور نہ فطری تقاضوں سے اغماض برتتی ہے۔ یہ ان تصورات اور اقدار کو محکم، منظم اور منضبط کرتی ہے جن کا الہام فطرتِ انسانی میں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جب دعوت کا آغاز فرمایا تو ابتدائی تعلیم میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں ہی کو نمایاں کیا اور ان اقدار کو رواج دینے کی ترغیب دی جو ہمیشہ سے اچھے انسانوں کے کردار کا حصہ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ابتدائی مکی سورہ البلد کی تعلیم یوں ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد ۱۱ - ۱۷)

"اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانہ میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔"

ان آیات میں غلاموں کو غلامی کے بندھن سے آزاد کرنے، قحط سالی کے زمانہ میں یتیموں کی خبرگیری اور مسکینوں کی سرپرستی کرنے، لوگوں کے حقوق ادا کرنے اور شفقت و رحمت کے ساتھ پیش آنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ یہ وہ بنیادی نیکیاں ہیں جو فطرتِ سلیمہ کے

چشمۂ صافی سے پھوٹتی ہیں اور تمام مذاہب کی تعلیمات کا مشترک سرمایہ ہیں۔ بعد کے ادوار میں اسی تعلیم کی ضابطہ بندی کر کے قانون کی شکل دے دی گئی مثلاً غلاموں کی آزادی کو بعض گناہوں کا کفارہ قرار دیا گیا۔ اس کو بلندیٔ درجات کے لیے ایک زینہ قرار دیا گیا۔ اور حوصلہ مند اور باہمت غلاموں کو یہ قانونی حق دیا گیا کہ وہ آقاؤں سے معاہدہ کر کے اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کریں۔ فقراء و مساکین کی بہبود کے لیے زکوٰۃ اور عُشر کے ضابطے وضع کیے گئے۔ یتیموں کی کفالت کے بارے میں مفصل ہدایات دی گئیں۔

آنحضرتؐ کی دعوت کا جائزہ لیں تو اس کا کوئی گوشہ خلافِ فطرت نظر نہیں آتا۔ نفاذِ احکام میں جو حدود و قیود نظر آتی ہیں ان کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسانی فطرت اپنی اصلیت پر قائم رہ سکے۔ اس میں فساد پیدا نہ ہو ورنہ وہ پستی کی طرف مائل ہو کر اپنے شرف و مرتبے کو کھو دے گی۔ اس دعوت میں انسان کے روحانی مطالبات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مادی مطالبات کے ضمن میں بھی ضروری رہنمائی دی گئی ہے۔ اس طرح یہ دعوت انسان کی ہمہ جہتی ترقی کی ضامن ہے اور وہی لوگ زندہ کہلانے کے حقدار ہوتے ہیں جن کے اندر اس ہمہ جہتی ترقی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی تعلیم سے استفادہ کرنے والی قوم نے صدیوں تک اپنی زندگی کا لوہا منوایا۔ اور روحانی و مادی دونوں میدانوں میں اقوامِ عالم پر اپنی فوقیت ثابت کرتی رہی۔ یہ فوقیت اس وقت تک اسے حاصل رہی جب تک اس نے رسول اللہ کی دعوت سے اپنے کو وابستہ رکھا۔ اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوا تو امت بھی اقوامِ عالم میں اپنا مقام کھو بیٹھی۔

یہ دعوت عقل سے مطابقت رکھتی ہے :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقل کے مطابق ہے عقل انسان کا وہ شرف ہے جس کے ذریعے وہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز ہوا ہے۔ گویا اس کی انسانیت کا انحصار اس کی عقل پر ہے۔ اگر یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو اس کے عروج کی کوئی حد نہیں ہوتی اور اگر اس سے محروم ہو جائے تو اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ عقل سے محروم انسان اپنی خصوصیتِ نوعی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اپنی فطرت تک کو بگاڑ لیتا ہے۔

آنحضرت کی دعوت کے عقل کے مطابق ہونے کے چار اہم پہلو ہیں۔ اولاً یہ کہ آپ

نے اپنی دعوت کو محض دعویٰ کے انداز میں مخاطبوں پر نہیں ٹھونسا بلکہ اس کو مدلل طور پر پیش فرمایا۔ جب توحید کی تعلیم دی تو توحید کے اثبات کے لیے مظاہر قدرت اور انسانی نفسیات سے استدلال کیا۔ قیامت کے دلائل کے لیے کائنات کے بامقصد ہونے، دنیا میں انسانی کرداروں کے متنوع ہونے اور فاطرِ کائنات کی عدل گستری جیسے حقائق پر اعتماد کیا۔ دعوتِ دین کے مباحث میں سابق انسانی تجربات کا حوالہ دیا۔ اس طرح ہر بات میں عقل سے کام لینے اور شعور کو بیدار رکھنے کی ترغیب دی۔ ثانیاً یہ کہ آپ نے معجزات کے مطالبہ کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ سابق انبیاء کے ہاں معجزہ مخاطب کو قائل کرنے کا اہم ذریعہ رہا تھا۔ آپ کے ہاں معجزہ کے مطالبہ کے جواب میں بھی ماحول میں موجود نشانیوں اور مظاہر قدرت پر غور کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالاتفاق آپ کا معجزہ قرآن حکیم ہے۔ ثالثاً آپ کی دعوت میں ہر بات کی حکمت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ احکام شریعت میں بھی احکام کے مقاصد متعین کیے گئے ہیں اور ہر حکم کے ساتھ اس بات کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ اس حکم کا دیا جانا کیوں ضروری تھا۔ مثال کے طور پر عبادات میں نماز یادِ الٰہی کے لیے، صدقہ و زکاۃ معاشرہ کے نادار اور مفلوک الحال طبقات کی بہبود کے لیے اور روزہ اور حج تقویٰ کی تربیت کے لیے ہیں۔ جرائم کی سنگین سزاؤں کا مقصد ان کو عبرت ناک بنا کر مجرموں کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس ہر حکم شریعت کی حکمت بیان کر دی گئی ہے۔ رابعاً آپ کی دعوت میں خلافِ عقل کوئی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود آپ کی تعلیم زمانے کی عقلیت کا ساتھ دیتی آ رہی ہے اور اسی لیے آج بھی مسلمان یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ تہذیبِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنا صرف اسلام کے ذریعے ممکن ہے دوسرے کسی مذہب میں یہ اہلیت نہیں کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ نیز یہ تعلیم عوام و خواص سب کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے۔

چونکہ حقیقی انسانی زندگی کا انحصار انسان کی عقل و بصیرت پر ہے اور اگر وہ اس سے محروم ہو جائے تو وہ اپنے منشائے تخلیق کے لحاظ سے مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے صرف رسول اللہؐ کی دعوت ہی حقیقی زندگی کی دعوت ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار کو بے نقاب کرتا ہے۔ اسی سے دل تجلیات و انوارِ الٰہی کا ایک آئینہ بن جاتا ہے اور انسان اپنی انسانیت کی تکمیل کرتا ہے۔

اجتماعیت کا لحاظ:۔

مذہب کا قدیم تصور یہ تھا کہ یہ بندہ اور خدا کے درمیان ایک انفرادی معاملہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے اس تصور کو مزید پختہ کیا۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ مذہب کا معاشرہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں اور ریاست تو مذہب سے بالکل ہی ماورا چیز ہے۔ یہود کو جو اجتماعی قوانین ملے ان کو انھوں نے نظرانداز کر دیا۔ اس لیے مذہب کا اجتماعی شعور ان کے ہاں ترقی نہ کر سکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر اجتماعیت کا لحاظ ہے اس شعور کو اتنا مستحکم کیا گیا ہے کہ مذہب فرد کی ضرورت تو تھا ہی اب معاشرہ کی ضرورت بھی بن گیا۔ آپ کی تعلیم میں سے اگر اجتماعیت کو نکال دیا جائے تو اسلامی معاشرہ کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ عبادات میں دیکھیے انفرادی نماز کی نسبت سے نماز با جماعت کا اجر پچیس گنا زیادہ بتایا۔ مسجد کو مسلم معاشرہ کی اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ صدقات و زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا اجتماعی نظام قائم فرمایا۔ نکاح و طلاق، تقسیم ترکہ، مالیات وغیرہ کے معاملات میں افراد کو معاشرہ کے نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ سورہ النساء میں حسنِ سلوک کے مستحقین میں نہ صرف اقربا بلکہ پڑوسیوں، ساتھیوں، ہم نشینوں، مسافروں اور مساکین کا بھی ذکر کیا تاکہ معاشرہ کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور بھائی چارہ پیدا ہو۔ اسی طرح امور ریاست میں شوریٰ کی بنیاد رکھ کر معاشرہ کو حکومت میں شامل کر دیا۔

دین میں اجتماعیت کے اس قدر لحاظ کا نتیجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پورے معاشرہ میں تعاون و تناصر اور امن و اخوت کی ضامن ہے۔ اگر کسی ماحول میں مسلمان اجتماعیت سے عاری ہوتے ہیں تو دین کے احکام پر کاربند ہونے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کے اندر اس بات کی کسک پیدا کرتی ہے کہ وہ دین کی خاطر منظم ہوں اور اس کے غلبہ کی جدوجہد کریں۔ امت مسلمہ کی رگوں میں ہمیشہ جو تازہ جذبہ دوڑتا رہتا ہے۔ جس کے باعث وہ پے در پے شکستوں سے دوچار ہونے کے بعد بھی نئی زندگی پاتی ہے اس کی بڑی وجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی یہی اجتماعیت ہے۔

دعوت کی آفاقیت:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے تمام انبیاء کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ خاص اقوام یا خاص علاقے کے لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ انہی کے اندر انہوں نے اپنی دعوت

پھیلائی اور اس حلقہ سے باہر اگر کوئی ان کی طرف متوجہ بھی ہوا تو اس کو انہوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی ۔ اس کے برعکس آنحضرت ؐ کی دعوت کے مخاطب تمام نبی نوع انسان ہیں ۔ بعثت کے فوراً بعد آپ نے بنی اسماعیل کو مخاطب کیا اور ان میں اپنی دعوت پھیلائی ۔ ہجرت مدینہ کے بعد یہود و نصاریٰ بھی آپ کے مخاطبین میں شامل ہو گئے ۔ جب عرب میں اسلامی ریاست کو قدرے استحکام ملا تو آپ نے عرب سے باہر کی ریاستوں کے بادشاہوں کی طرف سفیر بھیجے اور اس دور کی دو بڑی سلطنتوں ۔ فارس و روم ۔ کے فرماں رواؤں کو مکاتیب لکھ کر اپنی زندگی بخش دعوت کی طرف متوجہ کیا ۔ کسریٰ کو آپ نے جو نامہ لکھا اس کے الفاظ یوں تھے ۔

ادعوک بدعایة الله فانی انا رسول الله الی الناس کافة لا نذر من کان حیا ویحق القول علی الکافرین اسلم تسلم

"میں تجھے اللہ کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اللہ کا وہ رسول ہوں جو تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہے، تاکہ میں ہر اس شخص کو متنبہ کر دوں جس میں زندگی ہے ۔ انکار کرنے والوں پر بات ثابت ہو جائیگی ۔ تم اسلام قبول کر لو تو محفوظ رہو گے ۔"

دعوت کی اس آفاقیت کے سبب سے اس میں تمام نوعِ انسانی کی نفسیات اور ضروریات کا لحاظ ہے اس میں وقتی اور زمانی قسم کی کوئی بات نہیں بلکہ اس کو ہر زمانہ کے لیے ساز گار بنایا گیا ۔ اس میں اسود و احمر اور ابیض و اصفر ہر انسان کے لئے یکساں کشش پائی جاتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام عرب سے باہر نکلا تو افریقہ، ہسپانیہ، فارس، ترکستان، ہندوستان اور چین میں اس کی پذیرائی ہوئی، ملایا اور انڈونیشیا کے جزائر میں اس کے شیدائی پیدا ہو گئے ۔ اور آج یورپ اور امریکہ میں اس کا اثر محسوس ہونے لگا ہے ۔ تہذیبی و ثقافتی تفاوت کے باوجود مختلف اقوام اسلام کے دامن سے وابستہ ہونے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس اور امریکہ جیسی بڑی طاقتیں اپنے اختلافات ختم کر کے باہم تعاون کی سبیل نکال رہی ہیں مگر دونوں کے لیے جو چیز تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے مجتمع ہو کر عالمی قوت بن جانے کی صلاحیت ہے ۔ اس کو دونوں اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہیں اور مسلم اقوام میں سازشوں کے ذریعے نفاق کے بیج بوتی رہتی ہیں ۔

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	۔۔ — ۔۔
۲۔ اقسام القرآن	۹ — ۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے	۸ — ۰۰

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد)	۹۹۰ — ۰۰
: فی جلد	۱۱۰ — ۰۰
۲۔ مبادئ تدبر قرآن	۳۶ — ۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین	۰۰ — ۰۰
۴۔ اسلامی ریاست	۰۰ — ۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶ — ۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام	۴ — ۰۰
۷۔ تنقیدات	۱۸ — ۰۰
۸۔ توضیحات	۲۱ — ۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۵۰ — ۰۰
: جلد دوم	۳۶ — ۰۰
۱۰۔ مبادئ تدبر حدیث	۳۶ — ۰۰
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار	۴۰ — ۰۰
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۴۰ — ۰۰
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید	۵۶ — ۰۰
۱۴۔ حقیقتِ نماز	۲۲ — ۰۰
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ	۲۲ — ۰۰

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲ ۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور — ۵۴۶۰۰ ۔ پاکستان ۔ فون : ۲۸۳۴۳۷۷